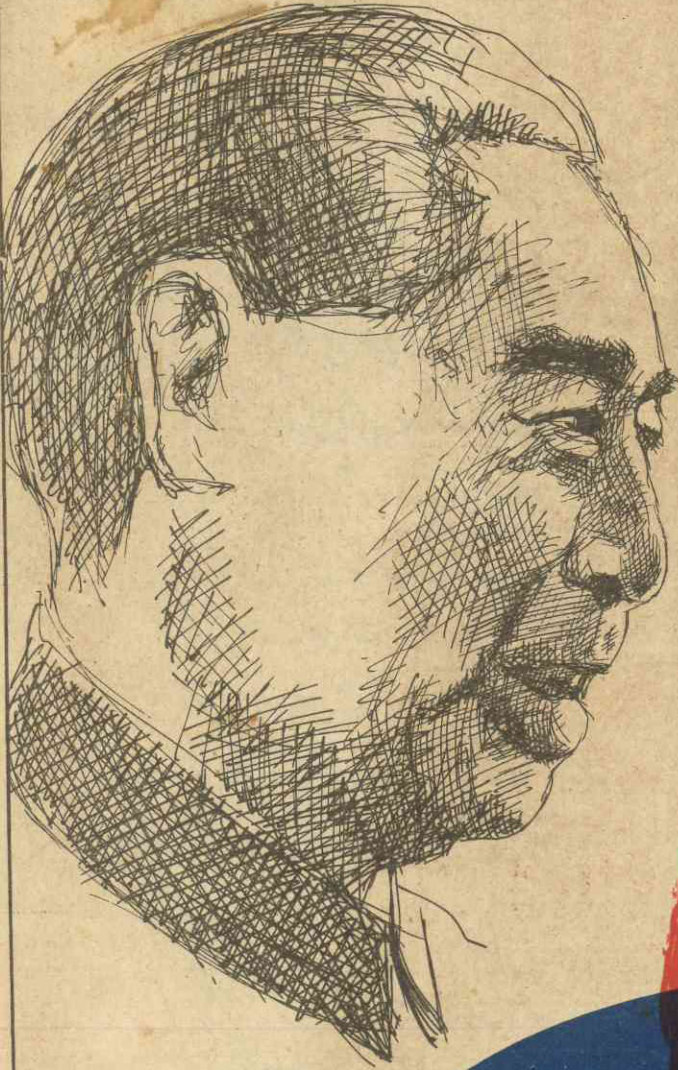
ہفت روزہ
الفتح
کراچی

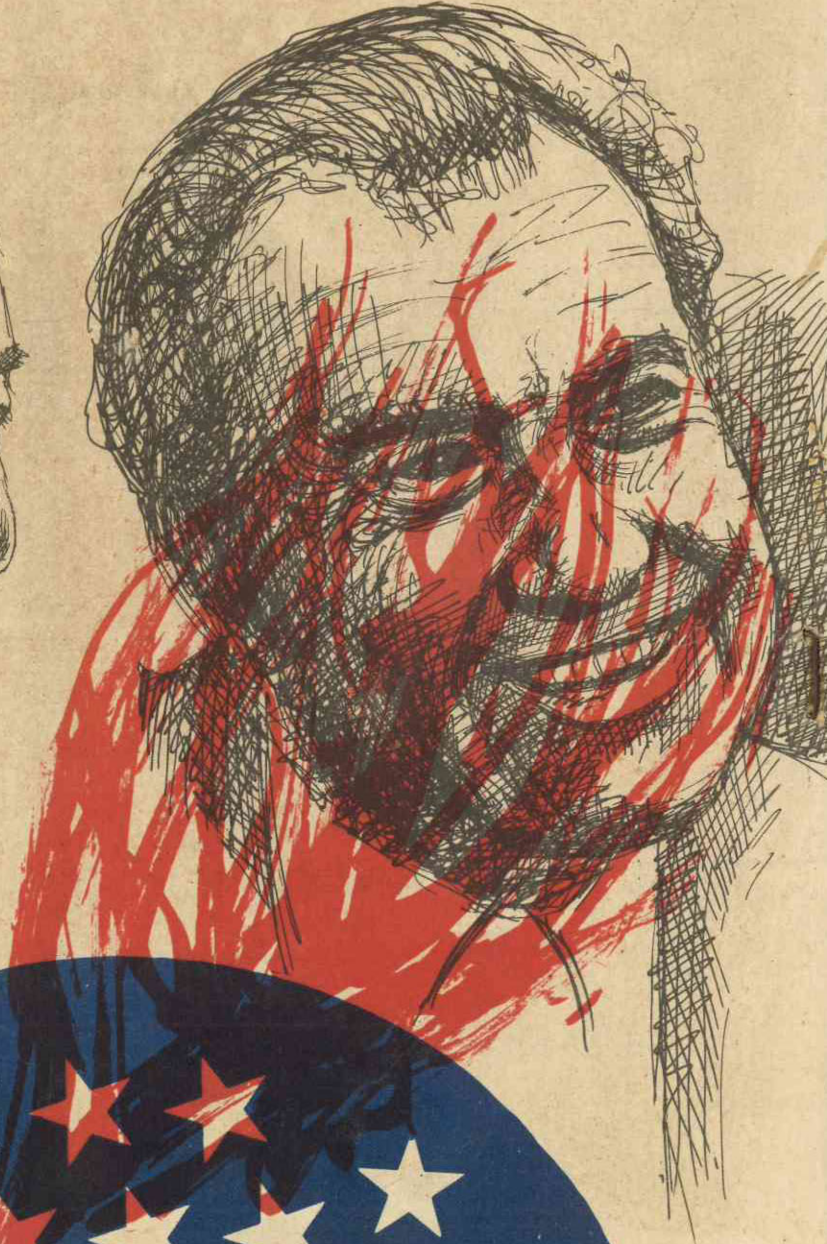
۲۴ر فروری - ۲ مارچ ۱۹۷۲ء

قیمت : ۵۰ پیسے - ہوائی ڈاک سے : ۷۵ پیسے

امریکہ — چین کی دہلیز پر







ایک مرثیہ

مشرقی پاکستان میں بہنے والے خون پر

محمود شام

سلام اے شہیدو!
سلام اے شہیدو!
کوئی رنگ بھی تھا
کوئی نام بھی تھا
کوئی بھی زباں تھی
کوئی ذات بھی تھی
— کہ تم کوئی بھی تھے
تمہارے لہو کی مہک ایک ہی تھی
تمہارے لہو کا تو رنگ ایک ہی تھا
کہ تم کوئی بھی تھے
کوئی رنگ بھی تھا
کوئی نام بھی تھا
تمہارے لہو میں مری آبرو تھی
تمہارے بدن میں مری زندگی تھی
سلام اے شہیدو!
تمہارا لہو رائیگاں
قبر تک بے نشاں
اور ہماری جبینوں پہ کوئی ندامت نہ فکرِ زیاں ہے
تمہارے لئے بھی کسی ماں کا سینہ تڑپتا تھا
دل کانپتا تھا
تمہارے جنم پہ بھی ماں باپ نے سینکڑوں خواب دیکھے تھے
تانے بُنے تھے
تمنّا ئیں کی تھیں
مگر گولیوں، دمدموں اور ٹینکوں کی نظروں میں سب ایک ہیں
آگ برسی تو ہر جسم جلنے لگا
خوں اُبلنے لگا
یہ لہو تو لہو تھا
کوئی رنگ تھا نہ کوئی نسل تھی
بھائی کا خون تھا
بھائی کی گولیاں تھیں
سلام اے شہیدو! سلام اے شہیدو
تمہیں یاد کوئی نہ ہم سے کرے گا
تمہارا لہو رائیگاں
ہم اگر یاد رکھیں گے تو یہ :-
کہ تم کیا زباں بولتے تھے
بہاری تھے
ابنِ زمیں تھے
سلام اے شہیدو!
سلام اے شہیدو!

خُدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد :— ۲ شمارہ :— ۴۱

۲۴ فروری - ۲ مارچ ۱۹۷۲ء

نگران
شوکت صدّیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونینِ خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدّیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت
وہاب صدّیقی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

سرورق :- اقبال مہدی

بدلِ اشتراک

	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۷۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰۰ فلس دوبئی قطر : ۷۵ درم
سعودی عرب : ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
پی، ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ٹیلیفون :— ۴۱۲۲۷۴

ایڈیٹر پبلشر :- ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

عکاس : الطاف رانا

ادار یہ

حاکمو! جواب دو

لاہور کے ایک مزدور رہنما بشیر احمد نے ۲۰ فروری کو گورنر ہاؤس کے سامنے اپنے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی اور "قائدِ اعظم زندہ باد" "قائدِ عوام زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔ بشیر مرحوم بادامی باغ کے ایک کارخانہ کے مزدوروں کی یونین کے صدر تھے۔ انہیں ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی وجہ سے برطرف کیا گیا تھا اور نئی حکومت نے جب مزدوروں کی بحالی کا اعلان کیا تو انہوں نے اپنے حق کے حصول کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ مالکان نے انہیں بحال نہیں کیا۔ حکومت کے کارندوں نے اُن کی مدد نہ کی۔ مایوسی نے اس المناک سانحہ کو جنم دیا۔

ہمیں یقین ہے کہ جب مرحوم بشیر کے بدن سے شعلے بلند ہو رہے ہوں گے، جب اُن کی زبان سے "قائدِ اعظم زندہ باد" اور "قائدِ عوام زندہ باد" کی صدائیں گونج رہی تھیں، جب ایک غریب اپنی آرزوؤں کا انتقام لینے کے لیے شاہراہِ قائدِ اعظم پر تڑپ رہا تھا، جب ایک مظلوم کی فریاد گورنر ہاؤس کے سامنے سرمایہ داروں اور اُس کی ایجنٹ نوکر شاہی کے خلاف دم توڑ رہی تھی تو لاہور کی زمین نے مطالبہ کیا ہوگا کہ "عوامی نمائندے بھی سرمایہ داروں کا محاسبہ کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں تو مجھے اجازت دو کہ میں اپنے مظلوم، بے بس اور بے یار و مددگار لاکھوں اور کروڑوں بیٹوں کو اپنی آغوش میں لے لوں، مجھے پھٹ جانے دو اور میرے ان مجبور و مقہور سپوتوں کو میرے سپرد کر دو ۔"

عوامی نمائندو ! لاہور کی دھرتی کو جواب دو۔ آج صرف ایک بشیر مرحوم کا سانحہ تمہارے سامنے آیا ہے۔ نہ جانے کتنے بشیر ان سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ انہوں نے تمہیں حکمرانی کے لیے منتخب کیا تھا کہ تم مزدوروں، کسانوں اور مظلوم عوام کے دوست ہو، تم اس ملک سے ظلم کی جڑیں اکھاڑ پھینکو گے، تم ظالموں سے ایک ایک پائی کا حساب لو گے، تم عوام کی حاکمیتِ اعلیٰ منواؤ گے، تم عوام کا ساتھ دو گے۔

عوامی نمائندو، دیکھو! بشیر نے دم توڑ دیا ہے۔ وہ تم سے مایوس ہو چکا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اتنا بڑا اقدام نہ کرتا۔ ہمیں یقین ہے کہ تم میں سے بھی بہت سے اس المیے پر رو دیئے ہوں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم میں بھی بعضوں کے دل خلوص سے معمور ہیں۔ لیکن تم یہ جانتے ہو کہ اس ڈیڑھ دو مہینے کی مدت میں ان لوگوں نے حاکموں کا گھیراؤ کر لیا ہے جو اس ملک میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے محافظ اور ترجمان ہیں۔

عوامی نمائندو، تمہاری صفوں میں وہ لوگ تقویت پکڑ رہے ہیں جو مزدوروں، کسانوں اور مظلوم عوام کے نام پر انتخابات جیتے لیکن وہ ان کے لیے مخلص نہیں تھے اور نہ ہیں۔ آج وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے عوام یہ اثر لینے پر مجبور ہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی میں ان نام نہاد اقتدار پسندوں اور عوام دشمنوں کو لگام نہ دی گئی تو یہ عظیم پارٹی کہیں کنونشن لیگ نہ بن جائے۔ یہ لوگ جہاں نوکر شاہی کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں وہاں اقربا نوازی اور خویش پروری سے بھی کام لے رہے ہیں۔ ان کی غلط قیادت میں رشوت ستانی اور سفارشیں پروان چڑھ رہی ہیں۔

عوامی نمائندو! کیا تم بتا سکتے ہو کہ بشیر مرحوم کے خون کی ذمہ داری کس کے سر پر ہے؟ عوامی نمائندو، کیا تم بتا سکتے ہو کہ حکومت نے ان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف کیا کارروائی کی جنہوں نے صدرِ مملکت اور گورنروں کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مزدوروں کو ملازمتوں پر بحال نہیں کیا، کارخانوں میں تالہ بندی کو جاری رکھا۔

عوامی نمائندو! تمہاری حکومت نے ان سرمایہ داروں کو شکنجے میں نہیں جکڑا تو کیا مصلحت کارفرما رہی۔ کیا تم جانتے ہو کہ مغربی پاکستان میں ہزاروں کی تعداد میں بشیر مارے مارے پھر رہے ہیں، ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں وہ تمہارے، لیبر کمیٹیوں، محکمۂ محنت اور دوسرے اداروں سے تنگ آ چکے ہیں، وہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ مزدوروں

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

ولی خانوں، اصغر خانوں، نورانیوں اور محمد طفیلوں کا اتحاد

سوالِ واقعی

رُوس

مغربی پاکستان کی تقدیر کا فیصلہ کر چکا ہے

محمود شام

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ملک کی تقسیم میں کل جو مجیب الرحمٰن کے ساتھ تھے، آج پھر مجیب کے ہمنوا ہیں اور باقیماندہ پاکستان کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے درپے ہیں

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے: کل جو جماعتیں پاکستان کے قیام کی مخالف تھیں اب استحصال سے آزاد نئے پاکستان کے قیام کی مخالفت کر رہی ہیں۔

وہی چہرے، وہی نظریے، وہی عوام کی دشمنی، صرف جماعتوں کے نام بدل گئے ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں ہوٹل پوربانی کے باہر وطنِ عزیز کے تقدس و احترام کی نشانی پاکستان کا پرچم جلایا گیا۔ مجیب نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا، یہ ابتدا تھی ——— آج حریت اخبار نے بتایا ہے کہ تحریکِ استقلال اور نیپ کے مظاہرین نے پیپلز پارٹی کے دفتر سدر بھٹو کی تصویر کے ساتھ ساتھ قائداعظم کی تصویر بھی پھاڑ دی، پیپلز پارٹی کے پرچم کے ساتھ ساتھ پاکستان کا پرچم بھی پھاڑ دیا۔ یہ کس بات کا اشارہ ہے یہ لوگ کیا چاہتے ہیں ——— پاکستان کا پرچم نہ ہوتا، قائداعظم کی قیادت نہ ہوتی، پاکستان کا قیام نہ ہوتا تو تحریکِ استقلال کے قائد اصغر خان کسی ایئر مارشل ارجن سنگھ کی ماتحتی میں کہیں بم گرا رہے ہوتے، انہیں یہ عزت قطعاً نصیب نہ ہوتی۔

ولی خان اس وقت سوچ سمجھ کر صوبائی تعصب کو ہوا دے رہے ہیں۔ پختونوں کی قیادت کا عَلم اٹھا کر وہ چاہتے ہیں کہ حکومت مشتعل ہو کر طاقت استعمال کرے اور پھر جو ہونا ہے ہو جائے۔ یحییٰ خان کے مارشل لاء، پھر اپنی پارٹی پر پابندی کو خاموشی سے برداشت کرنے والے ولی خان اس وقت طاقت کے مظاہرے پر کیوں اتر آئے ہیں؟ اندرونی اور بیرونی طور پر وہ فضا اس کے حق میں سازگار پا رہے ہیں۔ پاکستان اس وقت سفارتی سطح پر تنہائی کا شکار ہے۔ روس جیسی بڑی طاقت برصغیر کو ۱۹۴۷ء سے پہلے والی حالت پر لے جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ وہ چین کے مقابلے میں ۶۵ کروڑ کی آبادی پر مشتمل برصغیر کو اپنی سیاسی کالونی بنانا چاہتی ہے۔ بنگلہ دیش اس کو مل چکا، اب مغربی پاکستان کی باری ہے۔ بھٹو صاحب نے جس ہفتے اقتدار سنبھالا، میں نے ان کے نام ایک کھلے خط میں لکھ ڈالا تھا کہ بڑی طاقتیں مغربی پاکستان کی تقدیر کا فیصلہ کر چکی ہیں کہ صوبہ سرحد کہاں جائے گا، بلوچستان کہاں پنجاب اور سندھ کی تقدیر کس سے وابستہ ہوگی۔

ولی خان سوچے سمجھے اور پروگرام کے مطابق درجہ بدرجہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ قیام پاکستان کی مخالف دوسری جماعتیں بھی ہیں ——— یہ تو بیرونی تضاد ہے روس، چین کے مقابلے میں اس لائن کو اختیار کر رہا ہے ایک روسی سفارتی نمائندے نے راولپنڈی میں ایک اخبار نویس سے کہا تھا کہ "نیپ ایک طاقت ہے۔ اگر بھٹو نے نیپ کو ساتھ نہ ملایا تو انہیں جانا پڑے گا۔" یہ تو بیرونی سیاست کا تضاد ہے ——— اندرونی طور پر ولی خانوں، قیوم خانوں، نورانیوں اور محمد طفیلیوں کا اتحاد اس لیے ہو رہا ہے کہ پیپلز پارٹی میں جاگیرداروں کی موجودگی کے باوجود انہیں خطرہ ہے کہ بات آگے ضرور بڑھے گی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات پر زد پڑے گی اور اس فرسودہ نظام میں شگاف ضرور پڑیں گے۔ اس لیے اصغر خانوں قیوم خانوں، ولی خانوں، نورانیوں، محمد طفیلوں اور بگٹیوں کے ٹولے جمع ہو رہے ہیں۔ انہیں اخبارات اور خبر رساں ایجنسیاں بھی مل گئی ہیں۔ وہ اپنے مدافعانہ وار تیز تر کیے جا رہے ہیں۔ ولی خان کا یہ کہنا کہ پنجاب کے لیڈر سرحد میں آ کر سرحد کے کسانوں کو سرحد کے خانوں سے لڑوا رہے ہیں، ان کے طبقاتی شعور کا آئینہ دار ہے۔ مقابلہ کسان اور زمیندار کا نہیں بلکہ "سرحد پنجاب" کا ہے ولی خان سندھ میں آ کر اگر جاگیرداری کے خلاف تقریر کریں تو سندھ کے زمیندار کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ سرحد کا ایک لیڈر سندھ کے ہاریوں کو سندھ کے وڈیروں کے خلاف اشتعال دلا رہا ہے۔ یعنی کشمکش طبقوں میں نہیں صوبوں میں ہونی چاہیے۔ اس طرح سندھی صدر بھٹو کو سندھ کے علاوہ اور کہیں جاگیرداری، سرمایہ داری کے خلاف تقریر کرنے یا قوانین نافذ کرنے یا اصلاحات کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسی ذہنیت سے یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں ان خانوں کا کیا کردار ہو گا۔ یہی ذہنیت مجیب الرحمٰن کی بھی تھی۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کے غریب اور امیر کے درمیان کشمکش پیدا کرنے کی بجائے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تصادم پیدا کیا اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ——— آج مشرقی پاکستان کا عام آدمی اپنے ملک کی فوج کے بجائے دشمن ملک کی فوج کے قبضہ میں ہے۔ ولی خان سرحد اور بلوچستان کے عام آدمی سے بھی یہی سلوک کروانا چاہتے ہیں۔ ایک طرف وہ مارشل لاء کے خاتمہ کا مطالبہ کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ مارشل لاء کے جاری رہنے کے لیے بھی جواز فراہم کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجیب الرحمٰن کی طرح اپنی اسمبلی بلانے کی بھی دھمکی دی ہے۔ حالت یہ ہے کہ ان کے پاس سرحد میں تیرہ اور بلوچستان میں صرف ۹ سیٹیں ہیں۔ جب کہ کل سیٹیں ۴۰ اور ۲۰ ہیں سرحد اور بلوچستان میں خواتین کے الیکشن نے ان کی حتمی اکثریت کی قلعی کھول دی ہے۔ وہ بیرونی سیاست میں روس کے کندھوں پر کھڑے ہیں۔ اندرونی سیاست میں جمیعت العلمائے اسلام کا سہارا لے رہے ہیں۔

ولی خان اور دوسری جماعتوں کی طرف سے یہ عوام دشمن کردار تو متوقع تھا۔ اس سے کسی کو مایوسی نہیں ہوئی

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

قدرت اللہ شہاب کی جلاوطنی —— (۱)

یحییٰ کے دربار میں نوکر شاہی کا اعترافِ گناہ

شوکت صدیقی

اپریل ۱۹۶۹ء کی تیسری صبح تھی۔ ہال میں اعلیٰ سول اور فوجی حکام کا اجتماع تھا۔ یہ میٹنگ یحییٰ خان نے ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بلائی تھی۔ ان کے دورِ حکومت کی یہ پہلی میٹنگ تھی۔ اس کی ترتیب کچھ اس طرح تھی۔ آگے کی نشستوں پر فوجی جنرل، بریگیڈیر، کرنل اور لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ ان کے پیچھے سول حکام قطار اندر قطار بیٹھے تھے۔ فوجی افسروں کے چہروں پر شادابی اور شگفتگی تھی۔ وہ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے تھے۔ سول حکام کا عالم یہ تھا کہ ان کے چہرے خاموش، ہونٹ خشک اور دلوں میں وسوسے اور اندیشے تھے۔ ان سب کے آگے ایک پُرتکلف کرسی رکھی تھی۔ یہ اکلوتی کرسی یحییٰ خاں کے لئے تھی، جو ابھی پہنچے نہیں تھے۔ ہر آنکھ اُن کے لئے منتظر تھی۔

ان دنوں اسلام آباد کے سرکاری دفاتر میں وقت کی پابندی کا سختی سے خیال رکھا جاتا تھا۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے دفتروں کے دروازے بند کر دیے جاتے۔ دیر سے پہنچنے پر باز پرس ہوتی، تنبیہ کی جاتی۔ چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہ تھی۔ سب کے لئے یکساں قانون تھا۔ افسر اور کلرک، دفتری اور چپراسی وقت مقررہ پر پہنچنے کے لئے بھاگم بھاگ دفتر آتے۔ تاخیر سے ڈرتے، پوچھ گچھ سے گھبراتے لیکن یحییٰ خاں وقت مقررہ سے ٹھیک ۲۰ منٹ بعد میٹنگ میں پہنچے۔ اور اس شان سے پہنچے کہ چہرہ فروغ مے سے گلستان اور آنکھوں میں چراغ جھلملاتے تھے۔ ان کی آمد پر سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ یحییٰ خاں اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئے۔ وہ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر مسکرا کر جنرل عبدالحمید سے کچھ کہا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ لیفٹیننٹ جنرل پیرزادہ بولنے کے لئے اپنی نشست سے اٹھے۔ یحییٰ خاں نے اشارے سے انہیں بٹھا دیا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ پھر حاضرین سے یوں مخاطب ہوئے۔

چار ٹوپیاں

"جیسا کہ آپ سب کو علم ہے۔ ملک پر ایک بار پھر مارشل لاء لگ چکا ہے۔ لیکن یہ مارشل لاء پہلے مارشل لاء سے قطعی مختلف ہوگا۔ اس دفعہ کسی رعایت سے کام نہیں لیا جائے گا۔ کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔ یہ مارشل لاء صحیح معنی میں مارشل لاء ہوگا۔" یحییٰ خاں لمحہ بھر خاموش رہے، پھر کہنے لگے۔

"آپ کو یہ بھی علم ہے کہ میں نے تمام اختیارات سنبھال لئے ہیں۔ میرے سر پر اس وقت چار ٹوپیاں ہیں۔ پہلی ٹوپی صدر مملکت کی، دوسری مسلح افواج کے سپریم کمانڈر انچیف کی۔ تیسری چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی اور چوتھی بری فوج کے کمانڈر انچیف کی ہے۔ یہ ذمہ داریاں میں نے خوشی سے قبول نہیں کیں۔ حالات کا یہی تقاضہ تھا۔ ملک کو تباہی سے بچانے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ نظم ونسق درہم برہم ہو چکا تھا۔ قانون کا احترام اٹھ چکا تھا جس کا جو جی چاہتا تھا کرتا تھا۔ لوگ سڑکوں پر آ گئے تھے۔ توڑ پھوڑ کرتے تھے۔ آگ لگاتے تھے۔ جلسے جلوس تھے۔ مظاہرے تھے۔ گھیراؤ تھا، جلاؤ تھا۔ ہر طرف لاقانونیت اور افراتفری تھی۔ حکومت کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ ملک تباہ ہو رہا تھا۔"

وہ لمحہ بھر کے لئے رکے۔ پھر چیخ کر بولے۔ "اس تباہی کی ذمہ داری بڑی حد تک آپ پر عائد ہوتی ہے۔" یحییٰ خاں نے سول افسروں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "آپ لوگوں پر۔ آپ نے اس بڈھے (ایوب خاں) کے گرد گھیرا ڈال دیا تھا۔ یہ خوشامدیوں، چاپلوسوں اور نکموں کا ایسا گروہ تھا۔ جس نے اس شخص سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں چھین لی تھیں۔ اسے باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر کر دیا تھا ناکارہ اور مجبور بنا دیا تھا۔ اسے اندھا کر دیا تھا —— میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی بھی حالت میں ان بے غیرتوں کو چاپلوسی اور خوشامد کی اجازت نہیں دوں گا۔ کسی نے ایسی جرأت کی تو اس کا بُرا انجام ہوگا۔ میں اس کے ساتھ بدترین رویہ اختیار کروں گا۔ سخت ترین سزا دوں گا۔ اس کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔"

یہ کہتے کہتے یحییٰ خاں کی آواز اونچی اور اونچی ہوتی گئی۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں جلال اتر آیا۔ وہ اپنی بھاری بھرکم آواز میں شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ جب انہوں نے اپنی بات ختم کی تو ہال پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ سول افسروں کے دل دھڑکتے تھے۔ چہروں پر ہوائیاں اُڑتی تھیں۔ کئی لمحے اس خاموشی میں گزر گئے۔ پھر ایک سینئر سی۔ ایس۔ پی افسر اپنی نشست سے اٹھے (یہ غالباً ایم ایم احمد تھے)، وہ دونوں ہاتھ آگے باندھے۔ سر جھکائے کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہے پھر ٹھہر ٹھہر کر انہوں نے کہنا شروع کیا۔

کرپٹ اور نااہل نوکر شاہی

"صدر محترم! اس میں کوئی شک نہیں کہ سول انتظامیہ جس کا بدقسمتی سے میں بھی ایک رکن ہوں، سخت کرپٹ اور نااہل ثابت ہوئی ہے۔ ہم لوگ اپنے سسٹم کے آپ شکار ہوتے ہیں۔ ہم میں بہت سے بے ایمان ہیں۔ بہت سے نااہل اور نکمے ہیں۔ سابق صدر نے واقعی ہم کو خراب کرنے اور ہمارے ذریعے خود کو خراب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہم نہ صرف اپنی لغزشوں کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ اس پر سخت شرمندہ بھی ہیں۔" سینئر افسر لمحہ بھر خاموش کھڑے رہے۔ پھر یوں گویا ہوئے۔ "سر! آپ نے جو ذمہ داریاں سنبھالی ہیں، وہ بہت اہم ہیں۔ آپ یہ ذمہ داریاں نہ سنبھالتے تو ملک تباہ ہو جاتا۔ اس کا وجود ختم

کشمیر کے محاذِ جنگ سے یحییٰ خاں اور اعظم خاں کا فرار

ہو جاتا۔ آپ نجات دہندہ بن کر آئے ہیں۔ صرف آپ ہی اس ملک کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ اس مقدس فرض میں میں اور میرے تمام ساتھی، تمام سول افسر آپ کے ساتھ ہیں۔ ہر خدمت کے لئے آمادہ ہیں۔ ہم خلوص دل اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ ہم نہایت وفاداری اور تابع داری سے آپ کے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ ہماری کمزوریوں اور غلطیوں کو نظر انداز کر کے ہمیں خدمت کرنے کا موقع دینگے۔"

اس سینئر افسر کی تقریر کے ساتھ ساتھ یحییٰ خاں کے چہرے کی خشونت اور کرختگی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور جب انہوں نے یحییٰ خاں کے صدرِ مملکت بننے اور مستقبل میں عظیم قومی کارنامے انجام دینے کے بارے میں ایک "روحانی پیشوا" کی بشارت کا بطورِ خاص ذکر کیا تو یحییٰ خاں کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ گردن ہلا ہلا کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے ہر انداز کے ساتھ میٹنگ کا رنگ بدلتا گیا۔ فضاء کا بوجھل پن کم ہو گیا۔ اس بدلتے ہوئے ماحول میں قصیدہ خوانی کرنے والوں اور پیمان وفا باندھنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ یہ سب اعلیٰ سول افسر تھے۔ ایک اٹھا، دوسرا اٹھا۔ تیسرا اٹھا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی اٹھے۔ پھر غالباً الطاف گوہر اٹھے۔ انہوں نے مودب ہو کر، نظریں جھکا کر لہجے میں رقت طاری کر کے فرمایا۔

"صدر محترم! مجھ سے پہلے میرے سینئر اور قابل احترام ساتھی جو کچھ فرما چکے ہیں۔ اس کے بعد میرے لئے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا نہ صرف احساس ہے بلکہ شدت کے ساتھ احساس ہے —— ہماری تاریخ کے اس سنگین مرحلے پر آپ نے جو مقدس فریضہ سنبھالا ہے اس میں ہر محبِ وطن کی تائید اور حمایت آپ کے ساتھ ہے۔ میں ایک محبِ وطن کی حیثیت سے اپنی پوری وفاداری اور مکمل تعاون کا آپ کو یقین دلاتا ہوں۔"

الطاف گوہر کے بعد کچھ اور سول افسر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بھی یحییٰ خاں کی مدح سرائی کی۔ وفاداری کا عہد کیا اور پچھلی آوازوں میں اپنی آواز ملا کر بیٹھ گئے۔ خاصی دیر بعد قدرت اللہ شہاب کی باری آئی۔ وہ نشستوں کی چھٹی قطار میں بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے بولتے ہی ہال میں گویا ایک دھماکہ ہوا۔ یہ ان کا طرزِ تخاطب تھا۔ انہوں نے یحییٰ خاں کو صدر محترم کے بجائے "مسٹر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر" کہہ کر مخاطب کیا۔ یحییٰ خاں کے چہرے کی شگفتگی اچانک اڑ گئی۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ مگر وہ خاموش رہے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی بات کا آغاز اس سوال سے کیا۔ "مسٹر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر! اگر آپ اجازت دیں تو بات دوستانہ فضا میں کی جائے۔"

یحییٰ خاں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ضرور۔ ضرور۔ ہم چینی یا روسی نہیں ہیں۔ ہم دوست ہیں ہم پاکستانی ہیں۔ بات یقیناً دوستانہ فضا میں ہونی چاہیئے۔"

قدرت اللہ شہاب نے کہنا شروع کیا۔ "میں نہایت ادب سے پہلی بات یہ کہنا چاہوں گا کہ میرے محترم دوستوں نے یہاں جو کچھ کہا ہے مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ جو کچھ آپ نے کہا ہے اس سے بھی مجھے اتفاق نہیں۔ قطعی اتفاق نہیں۔" میٹنگ پر سناٹا چھا گیا۔ قدرت اللہ شہاب کی آواز گونجتی رہی۔ "سر! آپ نے جس خوشامد اور چاپلوسی پر اظہارِ نفرت کیا تھا۔ سابق صدر کی جس کمزوری کی نشاندہی کی تھی۔ کیا ابھی اور اسی وقت روپ اور بہروپ کا وہ ناٹک ایک بار پھر اسٹیج نہیں کیا گیا؟ معاف کیجئے، میں اس پیمان

"عوام صرف
ڈنڈا چاہتے ہیں ڈنڈا
ہم انہیں
ٹھیک کر دیں گے ——"

(جنرل پیرزادہ)

وفا اور اعتراف گناہ کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں......"

قدرت اللہ شہاب اپنی بات پوری نہ کر سکے۔ اچانک کئی آوازیں غصے سے بھری ہوئی ابھریں: "خاموش ہو جاؤ" "بیٹھ جاؤ" "بیٹھ جاؤ"۔ ان میں فوجی افسروں کے ساتھ سول افسروں کی بھی آوازیں تھیں۔ فوجی افسروں کی آواز میں غصہ اور نفرت تھی۔ سول افسروں کی آواز میں عجز اور التجا تھی۔ لیکن اس چیخ و پکار کے باوجود قدرت اللہ شہاب نہ بیٹھے۔ اور جب آوازیں رک گئیں تو انہوں نے پھر سلسلہ گفتگو جاری کیا۔

شیر کی سواری

"مسٹر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر! تجربہ حقیقت کی کسوٹی ہے۔ تجربے نے ثابت کر دیا کہ پہلا مارشل لاء ایک صحیح اقدام نہ تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اسے لبیک کہنے والوں میں میری آواز بھی شامل تھی۔ شاید زیادہ ہی اونچی تھی۔ مگر جلد ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ تجربے نے بتایا کہ مارشل لاء شیر کی سواری ہے۔ اس شیر پر سوار ہونا، ہو سکتا ہے کہ آسان ہو مگر اترنا بہت مشکل ہے۔ میری گذارش ہے کہ آپ اس شیر کی سواری نہ کریں، یہ خطرناک کھیل ہے۔ ملک کو مارشل لاء کی ضرورت نہیں۔ بنیادی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ لوگ مارشل لاء نہیں چاہتے۔ بہتر زندگی چاہتے ہیں۔ روزگار چاہتے ہیں۔ روٹی چاہتے ہیں۔ تعلیم اور علاج چاہتے ہیں۔ وہ۔ وہ..."

ایک بار پھر قدرت اللہ شہاب کو اپنی بات کہنے سے روک دیا گیا۔ اس دفعہ جنرل پیرزادہ اٹھے۔ انہوں نے غصہ سے چیخ کر کہا۔ "ہمیں تمہاری نصیحتوں اور لیکچروں کی ضرورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں ملک کی کیا ضرورت ہے۔ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ وہ ڈنڈا چاہتے ہیں ڈنڈا۔ مسئلہ صرف لاء اینڈ آرڈر (نظم و نسق) کا ہے اور ہم اُسے اچھی طرح ٹھیک کر سکتے ہیں۔ ہم سب کچھ ٹھیک کر کے دکھا دیں گے۔"

یحییٰ خاں نے پیرزادہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے لیکن قدرت اللہ شہاب کھڑے رہے۔ کئی سول افسروں نے التجا کے انداز میں کہا۔ "شہاب، بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ خدا کے لئے بیٹھ جاؤ۔ پلیز شہاب۔ تم نے سب کا موڈ خراب کر دیا"

قدرت اللہ شہاب بیٹھنے کے بجائے بولنے لگے۔ "مسٹر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر! اس وقت جب کہ فوج آ ہی گئی ہے تو اس کا کام ملک میں جمہوریت کی بحالی ہونا چاہیئے۔ سڑکوں کی جھاڑ پونچھ اور نالیوں کی صفائی میونسپلٹی کے سینیٹری انسپکٹر اور جمعدار اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ یہ فوج کا کام نہیں۔ فوج کو الیکشن کرا کے بیرکوں میں واپس چلا جانا چاہیئے۔ یہ فرض جس قدر جلد ہو سکے پورا کیا جائے ورنہ...."

جنرل پیرزادہ نے قدرت اللہ شہاب کی بات کاٹ کر یحییٰ خاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سر! کیا اس شخص نے آج کا اخبار نہیں پڑھا؟"

قدرت اللہ شہاب نے جواب دیا۔ "میں نے ایک

باقی صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ فرمائیں

پاکستانی ثقافت اور اس کی شخصیت کے بارے میں مجوزہ نیشنل کونسل آف کلچر کے

فیض احمد فیض سے ایک ملاقات



پاکستانی ثقافت کی شخصیت کب متعین ہوگی؟

محمود شام

فیض صاحب سے انٹرویو مجھے پیکنگ جانے سے پہلے لینا تھا۔ وقت بھی مقرر ہوا لیکن مجھے لاڑکانہ جانا پڑ گیا بات بیچ میں رہ گئی۔ پھر فیض صاحب کے ساتھ پنڈی جانا ہوا مگر راستے میں کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ اس کی فرصت نہ ملی۔ اس کے بعد پھر پیکنگ ائیرپورٹ پر بات ہوئی فیض صاحب کہنے لگے کہ یہاں شاید فرصت مل سکے، میں نے بھی سوچا کہ "پیکنگ میں لینن انعام یافتہ فیض احمد فیض سے انٹرویو" اچھی سُرخی ہوگی لیکن چین کی سرزمین پر یہ ۴۸ گھنٹے اتنی بھاگ دوڑ میں گزرے کہ اس سرخی کی نوبت نہ آسکی اور بالآخر انٹرویو یہیں کراچی میں ہوا۔

بات چیت فیض صاحب کے نئے منصب سے شروع ہوئی۔ مَیں نے وضاحت چاہی کہ آپ کے ادارے کا تعلق وزارتِ تعلیم و اطلاعات سے ہوگا یا وزارتِ ثقافتی امور سے ہوگا۔ فیض صاحب نے بتایا کہ ان کا ادارہ نیشنل کونسل آف آرٹس" قومی سطح پر ایک خودمختار تنظیم ہوگی۔ گزشتہ حکومت کی درخواست پر فیض صاحب نے ایک مبسوط رپورٹ تیار کی تھی۔ اس میں جو بنیادی اصول وضع کیے گئے تھے وہی اب اس ادارے کی بھی بنیاد ہیں۔ فیض صاحب نے بتایا کہ اس ادارے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ قومی سطح پر مختلف فنون کے فروغ اور ترویج کا اہتمام کرے۔ اس سلسلے میں پھر نچلی سطح پر صوبائی، ضلعی اور علاقائی سطح پر نمائندہ تنظیمیں قائم کی جائیں۔ اسی طرح چار قومی اداروں کا قیام بھی زیرِ غور ہے۔

۱۔ تھیٹر اور ڈرامہ

۲۔ موسیقی

۳۔ ادبیات

۴۔ فلم

اس میں دوسرے ملکوں سے ثقافتی تعلقات استوار کرنا بھی شامل ہے۔ اس سے پہلے ایسا ایک ادارہ موجود نہیں تھا جو ان تمام ثقافتی امور سے عہدہ برآ ہو سکے بعض ثقافتی امور وزارتِ تعلیم کے پاس تھے۔ بعض وزارتِ اطلاعات کے پاس۔ بعض ثقافتی سلسلوں کا تعلق ایکسپورٹ پروموشن بیورو سے تھا۔

فیض صاحب نے اس بات پر ازحد افسوس کا اظہار کیا کہ ۲۵ برس میں کوئی ادارہ یا کوئی تنظیم اتنا کام تک نہ کر سکی کہ یہی بتاتی کہ اس ملک کا کوئی کلچر بھی ہے یا نہیں جو ادارے موجود ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں ہے ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں سب نے بنا رکھی ہیں۔ ہمارے ملک کی ثقافت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی طرح ہماری ثقافت کی کوئی شخصیت متعین نہیں ہو سکی۔ آرٹس کونسل کا دائرہ کار بہت محدود تھا۔ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر رہا اور نہ قومی زندگی سے اس کا کوئی تعلق رہا۔ یہ باتیں بھی اوّل روز سے کی جا رہی ہیں، مختلف حکومتوں نے مختلف اوقات میں اس پر غور کیا۔ دو چار ماہ تک بات چلی، کمیٹی بنی، کمیشن قائم ہوا پھر بات کہیں نہ کہیں دفن ہو گئی۔ اس سلسلے میں آخری رپورٹ قدرت اللہ شہاب کے ایما پر ایوب خان کے آخری دور میں تیار ہوئی۔ اس کی تیاری میں چھ ماہ صرف ہوئے، دَورے ہوئے، میٹنگیں ہوئیں۔ کئی فنکاروں اور شخصیتوں کے انٹرویو ہوئے تب یہ رپورٹ مرتب ہوئی۔ ایوب صاحب کا زوال آگیا، رپورٹ دھری کی دھری رہ گئی۔ میرے خیال میں تو یہ رپورٹ پڑھی بھی نہیں گئی۔ حکومت کی طرف سے اس کی تصدیق نہ ہوئی اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ رپورٹ خفیہ دستاویز کے طور پر پڑی رہی۔ اب چونکہ اس سلسلے میں نئی وزارت بن گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اب کوئی نتیجہ برآمد ہو۔ اصولی طور پر طے ہو جائے تو پھر اس رپورٹ کی بنیادی سفارشات کو حالات کے مطابق ڈھالنے کے بعد کوئی مشینری بنائی جائے گی۔ جو یہ طے کرے گی کہ مختلف سفارشات کو قومی اور مقامی سطح پر عملی جامہ کیسے پہنانا ہے۔ پہلے ایک مختصر سا مرکز قائم کیا جائے گا جو تجاویز مرتب کرے گا۔ فیض صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ پہلے سے جو آرٹس کونسلیں اور نیشنل کونسلیں موجود ہیں، ان کے درمیان رابطہ، طریقِ کار میں یکسانیت پیدا کرنا پہلا قدم ہوگا۔ کیونکہ ایک نمونے اور ایک طرز سے اگر کام ہوگا تو اس کے نتائج جلد حاصل ہو سکیں گے۔

میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ حال ہی میں اسلام آباد میں ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ جس میں مختلف شعبوں کے قریباً تیس نمائندے شامل ہوئے۔ اس میں خدشہ یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس میں ہر کوئی بیوروکریٹک انتظام تو نہ ہوگا۔ کچھ لوگ پھر اوپر ہی اوپر بیٹھ کر کارروائیاں کرتے رہیں۔ میرے ذہن میں ہرگز ایسا تصوّر نہیں ہے۔ میرے خیال میں کلچر سرکاری دفتروں میں تخلیق نہیں ہوتا۔ سرکاری اداروں کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ سہولتیں فراہم کرے، کلچر تو لوگ خود پیدا کریں گے۔ ایسے ادارے ماحول اور سہولتیں مہیا کریں تخلیقی کام فنکار خود کریں اور ان فنکاروں کی اصلاح اور رہنمائی عوام کریں گے۔

میں نے ثقافت کی شخصیت کا سوال اٹھایا تو فیض صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ میری وہ رپورٹ پڑھ لیں میں نے تفصیل سے اس سلسلے میں بحث کی ہے۔ مَیں نے عرض

فنکار کلچر تخلیق کریں اور عوام ان کی اصلاح کریں

کیا کہ کچھ مختصراً بتا دیجئے تو انہوں نے ثقافت کے دو عناصر ظاہر کیے۔ نمبر (۱) داخلی اور نمبر (۲) خارجی۔ داخلی یا باطنی عناصر میں عقائد، خیالات، جذبات، خواب، آدرش اور وہ اقدار شامل ہیں جو کسی معاشرے کو عزیز ہوتی ہیں۔ خارجی عناصر میں دو طرح کے پہلو ہیں۔ ایک تو زندگی کا روزمرّہ کا معمول، رہن سہن، رسوم، زبان اور دوسرے ان کی ایک اسلوب یافتہ شکل، بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹ اور تراش کر پیش کرنا، اس کو فنون کہتے ہیں۔ پھر ثقافت کے تین دائرے ہیں۔

(۱) فن تخلیق کرنے والی ذات کا دائرہ

(۲) ایک شخص، جس معاشرے میں رہتا ہے یا جس وطن کا باشندہ ہے، وہ معاشرتی دائرہ۔

(۳) وہ شخص جس عہد میں زندہ ہے اور اس کی ہمعصر کائنات! ان تینوں دائروں کی سمتیں ہیں۔

(۱) ثقافت کا طول ـــ اس ثقافت کی تاریخ کا کس نقطے سے آغاز ہوتا ہے۔

(۲) ثقافت کا عرض ـــ یعنی جغرافیہ معاشرے کا زمینی دائرہ کہ یہ کس علاقے، کس وطن اور کس خطے تک محدود ہے۔

(۳) گہرائی ـــ معاشرے میں جس چیز کو ثقافت کہا جاتا ہے۔ اس کا مختلف طبقات میں کہاں تک نفوذ ہے۔ مثلاً عوام کے طبقے کا کلچر، خواص کا کلچر، جو معاشرہ طبقات میں بٹا ہوا ہو اس کا کلچر بھی طبقات میں بٹ جاتا ہے جس کو قومی ثقافت کہتے ہیں۔

اب تک عام طور پر یہ تصوّر رہا ہے کہ اوپر کے طبقے کی ثقافت، قومی ثقافت بنی رہتی ہے۔ اس طبقے کو سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جیسے جیسے طبقاتی تعلقات بدلتے ہیں اس کے کلچر میں بھی ایسے ہی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے مختلف علاقوں کی زبانیں اور رسم و رواج ہمارا تاریخی ورثہ ہیں۔ اس میں دو طرح کی تقسیم ہے۔ نمبر ایک علاقائی تقسیم اور نمبر ۲ طبقاتی تقسیم۔ بات یہ ہے کہ جب انگریز ملک چھوڑ کر گیا ـــ تو وہ قوم اور ثقافت دونوں کا خام مواد چھوڑ گیا تھا۔ اس سے ہمیں ایک امتزاج SYNTHESIS پیدا کرنا تھا۔ دیکھنا تھا کہ مختلف علاقائی ثقافتوں میں سے کون سی چیزیں مشترک ہیں۔ جن سے ایک قومی ثقافت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس طرح طبقاتی ثقافت، یعنی اوپر کے اور عوامی طبقے کی ثقافت میں سے کن اجزا کو یکجا کر کے SYNTHESIS بنایا جائے یہ کام ظاہر ہے کہ خود بخود نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے ارادی کوشش کی ضرورت تھی جو نہیں کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کے بارے میں اگر دریافت کیا جائے کہ اس کی ثقافت کیا ہے تو ہم جواب نہیں دے سکتے۔ کبھی ہم اس کا سلسلہ موہنجوڈارو سے شروع کرتے ہیں اور کبھی محمد بن قاسم سے۔ یہی معلوم نہیں

فیض صاحب اور درسِ قرآن

فیض صاحب کو اتنا اہم منصب ملا ہے تو میں نے چاہا کہ کچھ ان کے بارے میں بھی بات ہو جائے۔ فیض صاحب نے عربی میں ایم اے کیا ہے اور اوّل درجے میں۔ بی اے آنرز بھی عربی میں کیا۔ انگریزی کے ایم اے میں انہیں دوسرا درجہ ملا تھا۔ وہ کافی عرصہ تک ایم اے او کالج امرتسر میں عربی پڑھاتے رہے۔ انہوں نے تین بار درسِ قرآن لیا۔ ایک بار مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی سے، ایک بار علامہ اقبالؒ کے استاد شمس العلماء میر محمد حسین سے اور تیسری بار مولوی مُرشد سے درس لیا۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ جیل میں تھے اور قیدِ تنہائی میں انہیں کسی کتاب یا رسالے کی اجازت نہیں تھی اس وقت انہوں نے قرآن اور تجرید بخاری کی اجازت لی اور چار ماہ تک ان کا مطالعہ کرتے رہے۔ تجرید بخاری تو چار ماہ میں انہیں زبانی یاد ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہماری شاعری کا تو منبع ہی عربی شاعری ہے۔ عروض، علامتیں، تلمیحات زیادہ تر عربی سے آئی ہیں اور اگر کسی لفظ کا صحیح معنیٰ اور اس کا عربی ماخذ معلوم نہ ہو تو اسے کوئی شاعر یا ادیب صحیح طرح استعمال کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کسی لفظ کے معنوں کی کلاسیکی چاشنی کا مزا عربی کے الفاظ جانے بغیر نہیں اٹھایا جا سکتا۔

میں نے کہا کہ آپ پر جو مذہبی حلقوں سے الزام عائد ہوتے رہتے ہیں آپ ان کا جواب کیوں نہیں دیتے اور یہ کیوں نہیں بتاتے کہ آپ نے دین کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اوّل تو یہ لوگ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی لوگ ہیں۔ مجھے بتایئے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ اور نظام الدین اولیاؒ نے کس کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا؟ نیک لوگ تو ہمیشہ اچھائی کی تلقین کرتے ہیں۔ خود نیکی کا نمونہ پیش کرتے ہیں مگر ان مسجدی رہنماؤں کا کام محض بہتان تراشی ہے۔ حالانکہ بدگوئی سے خود ان کا ہی اخلاق بگڑتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ حساب اللہ تعالیٰ کو دینا ہے جب اللہ تعالیٰ پوچھے گا تو اس کو جواب دیں گے مجھے کیا معلوم کہ ان لوگوں کے دل میں کیا ہے، میں انہیں کیوں جواب دوں؟

انہوں نے آنحضرتؐ کا ایک واقعہ سنایا۔ کہ ایک صحابیؓ نے آنحضرتؐ کو بتایا کہ "جنگِ بدر میں ایک مشرک ان کے سامنے آیا وہ جب اس کو قتل کرنے کے لیے آگے بڑھے تو اس نے باآوازِ بلند کلمہ پڑھا کہ لا الٰہ الا اللہ ... مگر میں نے پھر بھی اسے قتل کر دیا۔"

پوچھا گیا کہ ـــ "کیوں؟"

صحابی نے بتایا کہ "اس کی جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے وہ جھوٹ بول کر جان بچانا چاہتا تھا"

اس پر نبی اکرمؐ نے پوچھا ـــ "کیا تو نے اس کا سینہ پھاڑ کر دیکھا تھا۔ یہ تیرا کام نہیں ہے کہ تو دُنیا کے سینے میں نقب لگا کر دیکھے"

کہ پہلا دائرہ کہاں ہے۔ اور دوسرا دائرہ مکہ مدینہ سے شروع ہوتا ہے یا خیبر سے، آگرہ سے شروع ہوتا ہے کہ دہلی سے اور یا واہگہ سے۔ پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچی ثقافتوں کو ہم قومی ثقافتیں مانتے ہیں یا نہیں، ہم نے اس میں سے کسی سوال کا بھی جواب نہیں دیا۔

فیض صاحب نے بتایا کہ اس رپورٹ کے سلسلے میں انہوں نے مختلف لوگوں کے خیالات معلوم کیے تھے تو اکثریت کی رائے یہی تھی کہ جو چیز قوم کے مزاج میں داخل ہو چکی ہے وہ ہماری ثقافت کا حصہ ہے چاہے وہ توران سے آئی ہو یا ایران سے۔ عرب سے آئی ہو یا بدھ مت سے۔ زندگی میں جو چیزیں سرایت کر چکی ہیں وہ ہمارے کلچر کا حصہ ہیں۔ اس سلسلے میں بات ہو تو عام طور پر جواب یہی ملتا ہے کہ ہماری تہذیب اسلامی تہذیب ہے دوسری بات کرنے کی کیا ضرورت ہے حالانکہ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اسلامی تہذیب تو مصر کی، سوڈان کی ہر جگہ کی ہے ہم میں کیا خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت اس وطن سے ہو سکتی ہے جس کے ہم رہنے والے ہیں۔

مَیں نے فیض صاحب سے پوچھا کہ آپ کا کیا منصوبہ ہے؟ انہوں نے بتایا کہ کسی ادارے کے بغیر تو منصوبہ بندی مشکل ہے۔ پہلا مرحلہ تو ایک قومی ادارے کا قیام تھا جس کا کام صرف حکم دینا نہ ہو بلکہ جو کچھ موجود ہے اس کو بروئے کار لایا جائے۔ مختلف فنون سے عوامی اور خواص کی سطح پر وابستہ جتنے بھی TALENT (جواہر) ہیں ان کو کیسے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے دیکھنا ہوگا کہ ہنر کہاں کہاں ہے، فن کس کے پاس ہے یہ بجائے خود ایک بڑا کام ہے اس کے لیے عملی اور تحقیقی طریقِ کار کی ضرورت ہے۔ فنکار سے مطلب صرف گانے بجانے والے ہی نہیں ہیں۔ بازی گر، مداری اور نٹ وغیرہ سب فنکار ہیں، پتلی نچانا بھی ایک فن ہے۔ ان سب کو دریافت کرنا ہوگا۔ دیکھنا ہوگا کہ کس کس کو کیا کیا سہولتیں مہیا کی جا سکتی ہیں۔ ان کے ذریعے ان کی تعلیم کا بندوبست! پھر ان کے ذریعے سے اور لوگوں کی تعلیم، دوسرا تحقیقی کام ہے۔ لوک فن کی تحقیق، کلاسیکی اور لوک موسیقی کی تحقیق۔ ادب میں جتنا سرمایہ موجود ہے اس کے بارے میں تحقیق۔ ہر فن کی عوامی سطح پر، پڑھے لکھے لوگوں، ان پڑھ لوگوں کی سطح پر پیشکش!

ہر علاقے کا اپنا ایک بڑا مرکز ہونا چاہیئے۔ بڑے شہر میں ایک مرکز کے علاوہ دوسرے علاقائی مراکز قائم

باقی صفحہ ۳۰ پر ملاحظہ فرمائیں



ایڈگر سنو

عوام دوست

صحافی اور ادیب

چیئرمین ماؤزے تنگ اور چو این لائی کے دوست، ممتاز امریکی صحافی اور ادیب ایڈگر سنو ۱۵ فروری ۱۹۷۲ء کو فوت ہو گئے ان کی عمر تقریباً ۶۶ برس تھی۔

ایڈگر سنو کی موت صرف ایک صحافی اور ادیب کی موت نہیں بلکہ یہ چین اور دنیا کے درمیان ایک رابطہ کی موت ہے۔ چینی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں ہونے والی تحریکِ آزادی اور چین کی ابھرتی ہوئی عوامی قوت سے دنیا کو متعارف کرانے کا سہرا ایڈگر سنو کے سر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چیئرمین ماؤزے تنگ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے "ایڈگر سنو نے چین کو دنیا سے متعارف کرانے کے لیے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں"۔

ایڈگر سنو ابتدا میں ایک صحافی کی حیثیت سے چین گئے۔ وہاں انہوں نے چین کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ انہیں ۱۹۲۹ء میں "چائنا ویکلی ریویو" کا مدیر بنا دیا گیا یہ ہفت روزہ سنگھائی سے شائع ہوتا تھا۔ "چائنا ریویو" کا مدیر بننے کے بعد ان کا براہ راست رابطہ چین کی عوامی قوتوں سے ہوا حقیقت پسند صحافی ہونے کی وجہ سے انہوں نے چین میں ہونے والی تحریک کو تعصب کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ چین کا نیم نوآبادیاتی اور نیم جاگیردارانہ معاشرہ تبدیلیاں چاہتا ہے۔ انقلابی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اس لیے چینی کمیونسٹ پارٹی کی کامیابی لازمی ہے۔ چنانچہ وہ ۱۹۳۶ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی اڈے ینان گئے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ اور چو این لائی سے ملاقاتیں کیں اور ان کا مؤقف معلوم کیا اور دنیا کو اس سے آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۱۹۳۷ء میں اپنی شہرہ آفاق کتاب "ریڈ اسٹار اوور چائنا"، لکھی۔ جس میں چینی کمیونسٹ پارٹی کا مؤقف تفصیل سے بیان کیا گیا۔ اور پیشن گوئی کی گئی کہ چین کی یہ ابھرتی ہوئی طاقت مستقبل قریب میں تمام رجعت پسندوں کو زیر کر لے گی اور اکتوبر ۱۹۴۸ء میں یہ بات درست ثابت ہوئی۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں ایڈگر سنو نے چیئرمین ماؤزے تنگ سے ایک طویل انٹرویو لیا اور پہلی مرتبہ انکشاف کیا کہ چینی قیادت صدر نکسن کو بحیثیت سیاح خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہے۔

ایڈگر سنو گزشتہ دو تین سال سے سرطان کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ آخری دنوں میں یہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ ان کے علاج کے لیے چیئرمین ماؤزے تنگ اور چو این لائی نے خاص طور پر دو چینی ڈاکٹروں اور ایک نرس کو بھیجا۔

اس کے علاوہ امریکی ڈاکٹر جارج بھی اُن کا علاج کر رہے تھے۔ ڈاکٹر جارج ایڈگر سنو کے دوست ہیں اور کافی عرصہ چین میں بھی رہ چکے ہیں۔ لیکن موت کا وقت آ چکا تھا۔ ڈاکٹروں کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور ۱۵ فروری کی صبح ایک عوام دوست اور حقیقت پسند صحافی اور ادیب ایڈگر سنو اس دنیا سے اُٹھ گیا۔



امریکہ چین کی دہلیز پر

چین

امریکی سامراج کے خلاف نبرد آزما رہے گا

الفتح رپورٹ

" عالمی انقلاب رواں دواں ہے
ایک پل شمال سے جنوب کو ملانے کا منتظر ہے۔
انسانیت کا سمندر اٹھا ٹھیں مار رہا ہے۔
شمال اور جنوب کا ملاپ کتنا دلکش ہوگا۔
پہاڑوں کی حسین دیوی
اگر زندہ ہے آج بھی تو
اس بدلی دنیا کو دیکھ کر جوشِ مسرت سے بیہوش ہو جائیگی"

(چیئرمین ماؤزے تنگ)

۲۱ فروری کو شمال نے جنوب کی دہلیز پر جبین بوسی کی۔ شمال کا نمائندہ صدر نکسن جنوب کا دورہ کر رہا ہے۔ دنیا کی نظریں جنوب کی جانب لگی ہوئی ہیں۔ وہ پردہ اٹھنے کی منتظر ہیں۔ یہ رُبع صدی کا اہم ترین واقعہ ہے اور بین الاقوامی سیاست کا اہم موڑ بھی ہے۔

امریکی سامراج جس نے کوریا کی جنگ کے دوران چین پر بمباری کرنے پر زور دیا تھا آج اُسی کا نمائندہ چین کی دہلیز پر سر رکھ رہا ہے۔ وہ اس ملک کا دورہ کر رہا ہے۔ جسے اُس نے ۲۰ سال تک دنیا سے الگ تھلگ رکھا۔ نکسن نے امریکی صدارت کا تاج پہننے سے پہلے ہی کہا تھا "ایشیا میں امریکی پالیسی کی بنیاد یہ ہونی چاہیئے کہ چین ایک حقیقت ہے۔" لیکن کس بات نے امریکی سامراج کو حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔

وہ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ۲۰ سال میں چینی عوام نے چینی کمیونسٹ پارٹی کے سُرخ پرچم تلے استحصال، ظلم، تشدد اور جبر و استبداد سے پاک معاشرہ قائم کیا۔ ایسا معاشرہ جس میں انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال نہیں ہوتا۔ چین میں وہ معاشرہ قائم کیا گیا۔ جس کی پیشن گوئی میکسیم گورکی کی "ماں" کے ہیرو نے ان الفاظ میں کی تھی۔

"میں جانتا ہوں ایک زمانہ آئے گا جب لوگ اپنی خوب صورتی پر حیرت زدہ ہوں گے۔ جب ہر انسان دوسرے تمام لوگوں کے لئے ستارے کی مانند ہوگا۔ اس وقت زندگی انسان کی عظیم خدمت میں تبدیل ہو جائے گی اور انسان ایک عمدہ اور اعلیٰ چیز بن جائے گا اس لئے کہ جو لوگ آزاد ہوتے ہیں۔ انہیں کو سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ پھر لوگ خوب صورتی، سچائی اور آزادی کے لئے زندہ رہیں گے۔ اور وہ لوگ سب سے اچھے مانے جائیں گے۔ جن کے دل ساری دنیا کو آغوش میں لینے اور اس سے محبت کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں وہ لوگ شاندار ہوں گے جو نئی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔"

چین کو آزاد کرانے اور سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے کے بعد چینی کمیونسٹ پارٹی نے افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے استحصال زدہ عوام کو آزاد کرانے کا بیڑہ اٹھایا۔ عوام کو بتایا گیا۔ کہ چینی انقلاب اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ سامراجی چنگل سے آزاد نہیں ہو جاتے۔ انہیں آزاد کرانے کے لئے چین کا طاقتور اور خوشحال ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ چیئرمین ماوزے تنگ نے کہا "جنگ کے خلاف تیار ہو جاؤ۔ آفاتی بیماریوں کے خلاف تیار ہو جاؤ اور عوام کے لئے ہر خدمت انجام دو۔" چینی عوام نے اپنے قائدِ عوام کی ہدایات پر سرِ تسلیم خم کیا اور انہوں نے خود کو عوام کی خدمات کے لئے وقف کر دیا۔ لیکن عوام دشمن طاقتوں نے چینی انقلاب کی راہ میں دیواریں کر دیں۔ امریکی سامراج پیش پیش تھا۔ بعد میں خروشچیف ٹولہ بھی اس ناپاک اور انقلاب دشمن منصوبے کا فریق بن گیا۔ امریکہ نے تائیوان کو تسلیم کر کے بیس سال تک چین کو عالمی برادری سے باہر رکھا۔ چنانچہ چیئرمین ماؤزے تنگ نے چینی عوام کو ہدایت کی۔ "خود اعتمادی اور خود انحصاری سے کام لو اور کٹھن جدوجہد کرو۔" چینی عوام نے اپنے دست و بازو پر اعتماد اور بھروسہ کر کے کٹھن جدوجہد کی اور ۲۰ سال میں چین ایک عالمی طاقت بن گیا۔ ایک ایٹمی طاقت بن گیا۔ اس کے بین البرّاعظمی میزائل ۶ ہزار میل تک مار کر سکتے ہیں۔ سان فرانسسکو کو اڑا سکتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس نے امریکہ کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ امریکہ نے چین کے اثرات روکنے کے لئے ہر قسم کے حربے استعمال کئے۔ امریکہ میں چینی لٹریچر پر پابندی لگا دی۔ تاکہ امریکی عوام سامراج کی استحصالی زنجیروں میں جکڑے رہیں۔ لیکن اس سلسلے میں بھی ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اور جب امریکی عوام نے ویت نام میں امریکی جارحیت کے خلاف مظاہرہ کیا تو وائٹ ہاؤس کے سامنے انہوں نے چیئرمین ماؤ کی قدِ آدم تصویر لگا دی۔

دوسری جانب چین نے بھی صدر نکسن کو دورہ کرنے کی اجازت دے دی۔ ایڈگر سنو کو انٹرویو دیتے ہوئے چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا کہ "صدر نکسن مہمان کی حیثیت سے آ

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرم

اسلام پسند اور مارشل لاء

ابراہیم جلیس

کل ایک تقریب میں دائیں بازو کے ایک اسلام پسند نام نہاد لیڈر جو مجھ سے شدید نفرت کرتے تھے بالکل خلاف توقع بڑے مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھے اور بولے۔

"صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔"

میں بڑا حیران ہوا کہ آخر مجھ سے کون سی ایسی "نیکی" سرزد ہو گئی کہ میرا اتنا شدید دشمن ایک دم مجھ پر مہربان ہو گیا ہے! میرے دشمن نے فوراً ہی میری حیرت یوں دور کی۔

"ماشاء اللہ ــــ آج کل مارشل لاء کے خلاف خوب لکھ رہے ہو۔"

پھر سرگوشیانہ لہجے میں بولے۔

"بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ مارشل لاء کے خلاف زبردست مورچہ لگایا جائے ــــ!"

میں یہ سرگوشیانہ انکشاف سن کر چکرا گیا کہ کیا واقعی مارشل لاء کے خلاف مہم بھٹو کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے بہ حیثیت ایک مورچہ استعمال کیا جا رہی ہے۔؟

میں تو اس قسم کے کسی مورچے یا اس قسم کی کسی سازش سے قطعاً ناواقف تھا۔ میں نے مارشل لاء کے خلاف جو کچھ لکھا تھا اُسی نیک نیتی سے لکھا تھا جس نیک نیتی سے خود قائد عوام بھٹو مارشل لاء کے خاتمے کے بارے میں بارہا کہہ چکے ہیں۔ یا جس نیک نیتی سے خان عبدالولی خان یا میر غوث بخش بزنجو۔ یا مولانا غلام غوث ہزاروی یا مفتی محمود مارشل لائ کے خلاف کہتے رہتے ہیں۔

میں پوری دیانت داری کے ساتھ مارشل لاء کو پاکستان کے لئے ایک نہایت مضر اور مہلک قانون سمجھتا ہوں۔ میں کسی شہری کو بھی بغیر مقدمہ چلائے نظر بند کرنے کا شدید مخالف ہوں۔ میرا ایقان ہے کہ پاکستان کی تمام برائیوں کا خاتمہ صرف اور خالص سوشلزم ہی سے ممکن ہے۔

میں ان اصولوں کے خلاف اپنے والدین اور بیوی بچوں سے مصالحت کے لئے آمادہ نہیں۔ لیکن اگر جانے پہچانے بدفطرت اور منافق لوگ بھی ان اصولوں کی حمایت پر اتر آئیں تو پھر مجھے ایک بڑا دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ کہ یالٹا کانفرنس کے دوران اس وقت کے تین بڑوں امریکی صدر روزویلٹ، برطانوی وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل اور روسی وزیر اعظم جوزف اسٹالن کو گپیں ہانکنے کے لئے کچھ وقت ملا تو روزویلٹ نے اسٹالن سے کہا۔

"ویل جوزف اسٹالن ــــ تم اتنے خوش کردار آہنی ارادے اور مضبوط عقیدے کے انسان ہو کر بھی دہریئے، لامذہب یا خدا کے منکر کیسے ہو گئے ــــ؟"

تو اسٹالن کے بجائے حاضر جواب چرچل جھٹ سے بول پڑا۔

"اسٹالن نے جس دن ہٹلر کو گرجا میں محوِ عبادت دیکھا۔ بس اُسی دن سے ٹھٹک گیا کہ اگر ہٹلر بھی مذہب میں یقین رکھتا ہے تو پھر میں دہریا اور لادین ہی بھلا۔"

اس حکایت کے مدِ نظر اب میں بھی یہ یقین کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر پاکستان کے سرمایہ داروں کا کوئی اسلام پسند ایجنٹ خان قیوم، دولتانہ اور میاں محمد طفیل جیسے نام نہاد لیڈر اور روزنامہ جنگ جیسے اخبار بھی مارشل لاء کے خلاف مہم چلا رہے ہیں تو پھر میں اپنے کان پکڑتا ہوں کہ میں نے اب تک پوری دیانت داری اور خلوص سے مارشل لاء کیخلاف جو مضامین لکھے ہیں وہ سب مضامین واپس ــــ وہ سب مضامین غلط ــــ اگر اس ملک کے عوام دشمن سرمایہ دار، جاگیردار، مالکان اخبار، انتخابات میں شکست خوردہ نام نہاد لیڈر جیسے نواب زادہ نصر اللہ خان، ایئر مارشل اصغر خان، پیر علی محمد راشدی۔ اے کے بروہی اور مالکان اخبار جیسے میر خلیل الرحمٰن، الطاف حسین قریشی اور معظم علی وغیرہ بھی مارشل لاء کے خاتمے کی مہم چلا رہے ہیں تو پھر ضرور کوئی گڑبڑ یا گھپلا ہے۔ ضرور کوئی سازش ہے۔ اگر یہ عوام دشمن لوگ بھٹو کے عوامی مارشل لاء کے مخالف ہیں تو پھر بھٹو کا عوامی مارشل لاء یقیناً اچھا اور عوام کے لئے بلاشبہ مفید ہے ــــ پھر مجھے بیچ بیچ ایک نہایت "خطرناک سازش" کا پتہ بھی چل گیا۔

میں نے تو صرف اپنی سوچ اور اپنے ضمیر کی ہدایت پر مارشل لاء کی مخالفت میں مضامین لکھے تھے۔ نہ کسی کے کہنے پر لکھے۔ نہ کسی عوام دشمن فرد یا جماعت کے اشارے پر یا انہیں تقویت پہنچانے کے لئے لکھے تھے۔

اگر نادانستہ طور پر عوامی مارشل لاء کے خلاف میرے لکھنے سے رجعت پسندوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں اور بھٹو کی عوامی حکومت کو ذرا سا بھی نقصان پہنچتا ہے تو آج سے میری توبہ ــــ!

قائد عوام بھٹو سے مجھے بعض اصولوں پر اختلاف کا جائز جمہوری حق حاصل ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی میں اُس زمانے سے بھٹو کو پاکستانی عوام کا ایک سچا ہمدرد عوامی رہنما سمجھتا ہوں جب کہ بھٹو وزیر خارجہ تھے اور انہوں نے ۱۹۶۲ء سے پاکستان کو ایک آزاد اور خود مختار خارجہ پالیسی کی شاہراہ پر گامزن کیا تھا۔ میں ۱۹۶۲ء سے مسلسل اپنی تحریروں میں مسلسل ترقی پسند بھٹو کا مداح رہا ہوں۔ میرا قلم اس وقت بھی ان کے لئے سرگرم تحریر رہا۔ جب کہ بھٹو ایوب کے معتوب تھے۔ میری نظر میں بھٹو وہ واحد دلیر رہنما ہے۔ جس نے ایوبی آمریت کے قبرستان میں اُس وقت نہایت بے خوفی سے آزادی کی اذان دی تھی جب کہ اِس ملک کے بڑے بڑے نام نہاد مذہبی رہنما ڈر کر اپنے حجروں میں چھپے بیٹھے تھے یا ہوائی اڈے پر ہر ڈکٹیٹر کے بازو پر امام ضامن باندھتے تھے۔

ہمارے سر جھکا دینے والی حالیہ جنگ کے بعد مجھے اگر کسی رہنما پر بھروسہ ہے کہ وہ اِس قوم کا سر پھر فخر سے بلند

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

پیکنگ سے ایک خط

بابو راج یا پرجا راج



پیکنگ میں پاکستان کا سفارتخانہ ریڈیو پاکستان کی نقالی پر اتر آیا

احفاظ الرحمٰن

نوکر شاہی نے پاکستان پر کون کونسے احسانات نہیں کیے ہیں۔ اس وقت ہمارا ملک جن سنگین حالات سے گزر رہا ہے اس کی ذمہ داری اسی طبقے پر ہے جو ہمیشہ سرمایہ داروں کے اشارے پر عوامی خواہشات کے لہو سے ہولی کھیلتا رہا ہے۔ اس باب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن عوام یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ نئی حکومت کی تشکیل کے بعد بھی یہ طبقہ بدستور اسی ڈگر پر چل رہا ہے۔ انہیں اب بھی کاروں اور بنگلوں کی ہوس ہے اور وہ اب بھی اسی طرح اپنی عیاشیوں پر قوم کی دولت ضائع کر رہے ہیں۔ نوکر شاہی کے ارکان اور فوج کے جرنیلوں نے مل کر ایسی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی اختیار کی کہ ملک کا ایک بڑا حصہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس عظیم المیے کے بعد بھی ان کے اطوار نہیں بدلے۔ خیال تھا کہ اگر ایک جمہوری طرز کی حکومت قائم ہو گئی تو شاید نوکر شاہی کے ارکان کو من مانی کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور وہ کم از کم اس حد تک عوامی خواہشات کو پامال نہیں کر سکیں گے جس حد تک کہ وہ ماضی میں کرتے رہے ہیں لیکن یہ طبقہ اب نئی حکومت کے ساتھ اس طرح چمٹا ہوا ہے جیسے یہ اس کا لازمی جزو ہو۔ اب بھی وہ اسی طرح ہر جگہ دندناتے پھر رہے ہیں۔ اندرونی اور بیرونی پالیسیوں میں اب بھی ان کو اتنا ہی عمل دخل حاصل ہے جتنا کہ روزِ اوّل سے تھا۔

صدر بھٹو انتخابات سے قبل بارہا نوکر شاہی کی مذمت کر چکے ہیں اور انہوں نے ان کو "فکس اپ" کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ یہ سب کچھ عوام کی خواہشات کے عین مطابق تھا کیونکہ جب تک یہ طبقہ موجود ہے۔ اس وقت تک عوامی مسائل جوں کے توں رہیں گے اور حالات ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ اب اگر عوام یہ دیکھ کر حیران ہیں کہ یہ طبقہ بدستور حکومت کا محور بنا ہوا ہے تو وہ حق پر ہیں۔ اس نازک مرحلے پر جو پاکستان کی تاریخ کا نازک ترین مرحلہ ہے۔ ہمیں "بابوؤں" کی ضرورت نہیں جن کے حوالے سے ایک بار پنڈت نہرو نے ہمیں اپنے طنز کا نشانہ بنایا تھا بلکہ سچے عوامی رہنماؤں کی ضرورت ہے جن کے دل میں عوام کا درد ہے اور جو خاموشی سے عوام کے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں اگر اس نئی حکومت میں بھی اس طبقے کو غلبہ حاصل رہا اور یہ "بابو" لوگ بدستور تمام پالیسی ساز اداروں پر چھائے رہے تو اس وقت ملک کی بقا کو جو خطرہ درپیش ہے وہ اور شدید ہو جائے گا اور ملک کے پسماندہ عوام جو ہر نئی حکومت سے بڑی توقعات وابستہ کر لیتے : یا اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جائیں

: پچھلی حکومتیں جن کا محور جاگیرداروں اور سرمایہ دار
کے ایجنٹ، نوکر شاہی کے ارکان تھے، ملک کو تباہی سے
کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے۔ ان کی دا
پالیسی کے طفیل عوام اپنے حقوق سے محروم رہے، سب
سسک کر زندگی بسر کرتے رہے۔ حق بات بولنے و
کو جیلوں میں ٹھونسا جاتا رہا اور عوامی پرچم کی جگہ سنگین
لی۔ دوسری طرف خارجہ پالیسی ایسی تھی کہ روز بروز
میں ہمارا ملک اپنا وقار کھوتا رہا اور ہم دنیا کی اقوام
بن کر رہ گئے۔ داخلی پالیسی کے نتائج ہم سب اپنی
سے دیکھ رہے ہیں۔ آج ملک کا ایک بڑا حصہ ہمارے
سے نکل چکا ہے اور اس پر ہمارے ازلی دشمن بھارت
ہو چکا ہے۔ اور ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی
پھیلتی جا رہی ہے اور عوام کے مسائل حل کرنے کے
حقیقی اقدامات نہیں کیے گئے۔ صرف روایاتی ہتھیار
کیے گئے تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہمارے ملک کا وجود
میں پڑ جائے گا۔

خارجہ پالیسی کے نتائج بھی سامنے آ چکے ہیں۔
سابقہ حکمراں ادھر ادھر ڈولتے رہے اور انہوں نے

بھارت نقارہ بجا رہا تھا، ہمارے نمائندے بوتلوں کے گرد رقص کر رہے تھے

کے سچے دوستوں سے دوستی بڑھانے کو کوئی اہمیت نہیں دی وہ ہر در پر سر رگڑتے رہے، سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے پاکستان اور دنیا بھر کے عوام کے اصلی دشمنوں کو گلے لگاتے رہے۔ مشرقی پاکستان کے مسئلہ پر اندرا گاندھی نے دنیا بھر سے ہمدردیاں وصول کی اور پاکستان کی خوب بھد اڑی ہوئی لیکن پاکستان کے سفارتی نمائندے وہسکی کی بوتلوں کے گرد ناچتے رہے، لمبی لمبی کاروں کی پوجا کرتے رہے جب کہ بھارت کے سفارتی نمائندوں نے اس زور کا نقارہ بجایا کہ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حالانکہ اس مسئلہ پر پاکستان حق پر تھا۔ سفارتی نمائندے تو یوں بھی بہت سی الٹ پھیر کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے "بابوؤں" کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنے منصفانہ موقف اور بھارت کی مداخلت پر دنیا کی تائید حاصل کرتے۔ مسئلہ بالکل واضح تھا۔ مشرقی پاکستان کا مسئلہ پاکستان کا اندرونی مسئلہ تھا اور اس کا فیصلہ صرف مشرقی پاکستان کے عوام کر سکتے تھے، بھارت کو اس میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا لیکن بھارت نے مداخلت کی اور اس دیدہ دلیری اور صفائی سے مداخلت کی کہ دنیا نے خوب خوب تالیاں بجائیں۔ بھارت، جو اپنے ملک کی اقلیتوں پر بے حساب ظلم توڑتا ہے "بنگلہ دیش" کے مظلوم عوام کا "غمگسار" بن گیا۔ ہم چاہے لاکھ ناپسند کریں لیکن حقیقت ہے کہ یہ بھارت کے لیڈروں اور اس سے بھی زیادہ اس کے سفارتی نمائندوں کا کارنامہ ہے۔

بھارت کی اس سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے ہمیں اسی قسم کے سفارتی نمائندوں کی ضرورت تھی۔ کیونکہ "بابوؤں" کا یہ طبقہ جس کا خمیر انگریزوں کے جوتوں کی دھول سے اٹھا ہے اور جو بڑے بڑے جاگیرداروں اور ۲۲ سرمایہ دار خاندانوں کے مفادات کا تحفظ کر کے سرخرو ہوتا ہے، اس کام کا اہل نہیں تھا۔ اس نے اس دفعہ پھر عوام کے مفادات سے غداری کی اور اطلس اور کمخواب سے سجی ہوئی خواب گاہوں میں سوتا رہا۔ سابقہ حکومت آخر وقت تک یہ سمجھتی رہی کہ بھارت اس مسئلہ پر اس قدر جلد فوجی جارحیت کی راہ اختیار نہیں کرے گا اس کے سفیر وائٹ ہاؤس اور کریملن سے یقین دہانیوں کے پلندے پر پلندے لاتے رہے لیکن کسی نے حالات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور ان کے مطابق اپنے موقف کی وضاحت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا۔ انہوں نے پھر اپنی پرانی بیسواؤں کے قدموں پر پھول چڑھائے اور عوام کے مفادات کو کھلم کھلا نیلام کر دیا۔ بہرحال بہت سے ممالک ایسے تھے جہاں ہم عوام کی تائید و حمایت حاصل کر سکتے تھے۔ یہ محاذ اتنا محدود نہیں تھا کہ غیر ملکی حکومتوں کو مراسلات پہنچا کر اس پر فتح حاصل کی جا سکتی۔ اس کے لیے ایک مؤثر پراپیگنڈہ مشینری کی ضرورت تھی۔ غیر ممالک کو ہر ممکن ذریعے سے اس مسئلہ کے ان نکات کی تفصیل بتانے کی ضرورت تھی جو ہمارے حق میں جاتے تھے اور پھر اندرا حکومت نے جس قدر وسیع پراپیگنڈا کر کے دنیا بھر کے عوام کی ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں اس کا توڑ یہی تھا کہ عوامی سطح پر اخبارات، ریڈیو، جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کے ذریعے غیر ممالک کے سامنے اپنے موقف کی وضاحت کی جاتی۔ یہ سب نہیں کیا گیا۔ کیونکہ جن لوگوں کو یہ فرض سونپا گیا تھا وہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں اور وائٹ ہاؤس اور کریملن کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

اس ضمن میں خود صدر بھٹو اس حقیقت کی نشاندہی کر چکے ہیں کہ ہمارے سفارت خانوں کی کارکردگی انتہائی پست رہی جب کہ بھارت اس میدان میں بازی لے گیا۔ مجھے پیکنگ میں رہتے ہوئے تین سال ہو چکے ہیں اس دوران بعض ایسے حقائق سامنے آئے ہیں کہ ان کا احساس کر کے دکھ ہوتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب چین میں ہمارے

جنہیں پروپیگنڈے کا
مشن سونپا گیا وہ
وہ وائٹ ہاؤس اور
کریملن کے مفادات
کا تحفظ کرتے ہیں

سفارت خانے کی کارکردگی کا یہ عالم ہے تو دوسرے ممالک میں کیا کیا حماقتیں نہ کی جاتی ہوں گی۔ میں جب یہاں آیا تو تقریباً ایک سال تک مجھے سفارت خانہ کی جانب سے کوئی لٹریچر، پمفلٹ یا کوئی بلٹن نہیں بھیجا گیا۔ سفارت خانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ غیر ممالک میں رہنے والے اپنے شہریوں کو اپنے ملک کے حالات سے باخبر رکھے۔ میں نے خود ہی PURSUE کیا اور بار بار اصرار کرتا رہا کہ آخر سفارت خانے کی مطبوعات مجھے کیوں نہیں بھیجی جاتیں؟ خدا خدا کر کے انہوں نے اس "نیک کام" کا آغاز کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ تمام خبریں اور تمام فیچر ریڈیو پاکستان کے پروگراموں سے نقل کیے گئے تھے۔ جب ریڈیو کے ذریعے لوگوں کو اس قسم کی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر ان مطبوعات پر قوم کا سرمایہ ضائع کرنے کا کیا جواز ہے۔ ریڈیو کے پروگراموں کے ذریعے، جیسے کہ ہمارے یہاں ہوتے ہیں، ملک کے اندر تو عوام کو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن غیر ممالک میں ٹھوس پراپیگنڈے کی ضرورت ہوتی ہے جس کی تکنیک سے ہمارے سفارت خانے نابلد ہیں پھر انہیں اپنی ڈانس پارٹیوں سے کب فرصت ملتی ہے کہ وہ ایسے قومی مسائل کی طرف توجہ دیں۔ بہرحال کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ پھر بند ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے مسئلہ نے سنگین صورت اختیار کی تو ایک بار پھر نظر کرم کی بارش ہوئی اور اس بار پھر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نازک دور میں بھی "ڈھاک کے وہی تین پات"! چند ایک مضامین کے علاوہ تمام مواد ریڈیو پاکستان کی خبروں اور یحییٰ خان کی تقریروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس نازک دور میں بھی اس محاذ پر کام کرنے کی رفتار پہلے جیسی تھی اور مطبوعات کا معیار بھی سطحی تھا۔ اس سطحی لٹریچر کا لوگوں پر کیا اثر ہوتا ہوگا اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ مطبوعات دوسرے ممالک کے سفارت خانوں کو بھی بھیجی جاتی ہیں۔ دوسری طرف بھارت زور شور سے اپنا پراپیگنڈہ کرتا رہا اور دنیا کی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرتا رہا۔ اگر یہ تساہل اور چشم پوشی صرف ہم پاکستانیوں تک ہی محدود ہوتی تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا لیکن دکھ کی بات تو یہ ہے کہ یہاں دوسرے ممالک کے سفارتی حلقوں کو بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یہ کس قسم کی ڈپلومیسی ہے؟ کس قسم کی پالیسی ہے؟

پیکنگ میں فلسطینی مجاہدوں کی تنظیم لبریشن آرگنائزیشن کا مستقل مشن موجود ہے اور آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جب سے یہ مشن قائم ہوا ہے اس وقت سے اب تک ہمارے سفارت خانے کی جانب سے اسے کوئی لٹریچر نہیں بھیجا گیا جب کہ بھارتی قونصل خانہ بڑی سرگرمی اور باقاعدگی کے ساتھ ان کو اپنی تمام مطبوعات بھیجتا رہتا ہے۔ اور یہ معاملہ یہیں تک محدود نہیں ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج تک اس مشن کے نمائندے کو پاکستانی سفارت خانے کی کسی تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا جبکہ دوسرے ممالک کے سفارت خانے باقاعدگی کے ساتھ ان کو

نئی حکومت کو سرمایہ داروں اور نوکر شاہی سے چھٹکارہ حاصل کرنا ہوگا

مدعو کرتے ہیں۔ خود چینی حکومت بھی اپنی ہر تقریب میں اسے مدعو کرتی رہتی ہے۔ اس بار پھر یہی نامناسب رویہ اختیار کیا گیا۔ صدر بھٹو پیکنگ آئے اور انہیں وزیر اعظم چو این لائی کی جانب سے ضیافت دی گئی تو فلسطینی سفارتی نمائندے کو بھی مدعو کیا گیا لیکن جب پاکستانی صدر کی جانب سے ضیافت کا اہتمام کیا گیا تو ہمیشہ کی طرح اس بار پھر فلسطینی نمائندے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ مہمانوں کی فہرست سفارت خانہ تیار کرتا ہے۔ یہ اس کی کوتاہی ہے اور چونکہ ہر بار یہی رویّہ اختیار کیا جاتا ہے اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے فلسطینی مجاہدوں کی اس تنظیم کے بارے میں یہی پالیسی بنا رکھی ہے کہ "یہ کس کھیت کی مولی ہیں؟"

پاکستانی عوام فلسطینی جانبازوں کی جدوجہد کی بھرپور حمایت کرتے رہے ہیں۔ ہمارے دل فلسطینیوں کی بندوقوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ یہ حقیقت الفاظ کی محتاج نہیں ہے سب کو معلوم ہے کہ پاکستانی عوام فلسطینی مجاہدوں کی جدوجہد کو اپنی جدوجہد سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارے بھائی ہیں جو اپنے وطن کی آزادی کے لیے اور بقا کے لیے نہایت بے سروسامانی کے عالم میں لڑ رہے ہیں۔ اور جب مَیں یہ دیکھتا ہوں کہ چین جیسے ملک میں بھی جو مظلوم اقوام کا سب سے بڑا حلیف ہے خود ہمارا پاکستان ان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کرتا ہے تو سَر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے یا یہ محض غفلت اور تساہل کا نتیجہ ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ رویہ قابلِ مذمت ہے قوم کی دولت کا ایک بہت بڑا حصّہ جو ملک کے مزدوروں اور کسانوں کا لہو نچوڑ کر حاصل کیا جاتا ہے' ان سفارت خانوں پر صَرف کیا جاتا ہے۔ ان میں کام کرنے والے جاہ پرست افسروں کو بڑی بڑی تنخواہیں زرِ مبادلہ کی شکل میں مل رہی ہیں اور یہ سب ناز نخرے اس لیے اٹھائے جا رہے ہیں کہ وہ دوسرے ممالک میں پاکستان کی سربلندی کے لیے کام کریں، زیادہ سے زیادہ افراد کو پاکستان کا دوست بنائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پاکستان سے روشناس کرائیں۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ دوستوں ہی کو متنفر کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں یہ ایک انتہائی سنگین مسئلہ ہے۔ فلسطینی مجاہدوں کے ساتھ جو اپنے گھر کی دیواروں سے محروم ہیں۔ اس قسم کا رویہ ناقابلِ معافی ہے۔ ہمارے عوام فلسطینی مجاہدوں کے ساتھ بے پناہ محبت رکھتے ہیں اور ان مجاہدوں کے لیے جان تک دینے کا جذبہ رکھتے ہیں اور یہاں انہیں اس قابل بھی نہیں سمجھا جاتا کہ انہیں اپنی تقریبات میں مدعو کیا جائے۔ اور انہیں اپنا لٹریچر بریف کرتا ہے۔ اسے وہاں کے حالات بتایا ہے۔ اور وہاں کی روایات سے روشناس کراتا ہے تاکہ اس سے نادانستہ طور پر کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ سُن لیجیے۔ جب بھٹو صاحب پچھلی بار سابقہ حکومت کی طرف سے پیکنگ آئے اور انہوں نے یہاں عوامی ہال میں تقریر کی تو انہوں نے چین کی ایک ایسی شخصیت کی صحت کے لیے جام تجویز کیا جس کا وجود چین کی سیاست سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ساتھ کام کرنے والے دوسرے غیر ملکیوں نے بڑا مذاق اڑایا کہ تمہارا لیڈر چین کا دورہ کر رہا ہے اور اسے اتنی اہم تبدیلی کا بھی علم نہیں۔ جبکہ دوسرے ممالک کے سفارت خانے احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے سفارتخانے کو خود اس تبدیلی کا علم نہیں تھا یا وہ بھٹو صاحب کو بریف

ایک سال تک مجھے

اپنے سفارتخانے سے

کسی قسم کا لٹریچر، یا

بلیٹن فراہم نہ کیا گیا

بھیجا جائے۔ عوامی خواہشات کو پامال کرنے کا دستور ابھی تک برقرار ہے۔ نوکر شاہی ابھی تک پہلے کی طرح طاقتور ہے اور من مانی کارروائیاں کر رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ طبقہ اب بھی اسی طرح ہمارے سروں پر مسلط رہا تو کیا عوام یہ سوچنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ پرانی حکومتوں اور نئی حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے اور نئی حکومت بھی روایات کے مطابق وعدوں کے رنگین غباروں سے جو ہوا میں اڑ جاتے ہیں، ہمارا دل بہلانا چاہتی ہے۔

عام طور پر جب کسی ملک کا سربراہ کسی دوسرے ملک کا دورہ کرتا ہے تو اس کا سفارت خانہ اسے اچھی طرح

نہیں کرسکے۔ کیونکہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ ایسے مو
پر تقریریں سفارت خانوں کے افسروں کے مشورے
تیار کی جاتی ہیں۔

یہ چند ایسے واقعات ہیں جن کا علم مجھ جیسے گو
کو بھی ہے۔ اس طرح کے اور نہ جانے کتنے کارنامے ہوں
ہمارے ملک کے نامۂ اعمال میں لکھے جا رہے ہوں
درونِ خانہ راز ہماری نظروں سے پوشیدہ ہیں' اند
نہ جانے کیا گُل کھلائے جاتے ہوں گے۔

اگر نئی حکومت سرمایہ داروں اور ان کے ایجن
نوکر شاہی کے ارکان کے غلبہ سے چھٹکارا حاصل نہیں
گی تو وہ عوامی کام نہیں کر سکے گی۔ ہمارے ملک کو ج
عظیم المیہ سے دوچار ہو چکا ہے۔ اس وقت اسے سی
نوکر شاہی کے کارندوں اور افسروں کی ضرورت نہیں
اسے ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے جو ان کا دکھ جا
اور اس کا مداوا کرنے کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا
اس وقت پاکستان کا اصل تضاد اس خطے میں م
جو اس کی بقا کو لاحق ہے۔ پاکستان کو کس طرح
جائے۔ یہ سوال آج کا سب سے اہم سوال ہے
بھارتی توسیع پسندوں اور روسی ترمیم پسندوں کی
چلا گیا تو دنیا کی ترقی پسند قوتوں کو زبردست نقص
گا۔ اگر ہم پاکستان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہم
بنیادی کمزوریوں کو دور کرنا ہوگا جو گھن کی طرح
اندر ہمیں چاٹے جا رہی ہیں۔ پاکستان کو ایک
خوشحال پاکستان بنانا ہے تو ہمیں پرانے بوسی
چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا، جاگیرداروں اور سرمایہ دا
استحصال سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا، نوکر شاہی
سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ برطانوی آقاؤں کا
غلامی کی طرف لے جا سکتا ہے' لیکن ہمارے مسائل
سکتا۔ یہ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے کہ نوکر شاہی
ارکان کی جگہ جنہیں ہمیشہ اپنے لباس کی کریز کی
ان عوامی راہنماؤں کو دی جائے جو عوام کے
لیے جدوجہد کرنا جانتے ہیں۔ اس قسم کی تبدیلی
یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ہم ایک لمح
غافل ہوئے، پرانی ڈگر پر چلتے رہے اور اپنے
دشمنوں کا قلع قمع نہ کیا تو ہماری تاریخ بہت مخ
——— بہت ہی مختصر۔





سرکاری خزانے کو پندرہ لاکھ نواسی ہزار دو سو روپے کا نقصان پہنچایا گیا

بدعنوانیوں اور دھاندلیوں کا اکھاڑہ — محکمہ ٹیلیفون

وہاب صدیقی

محکمہ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے ۱۳۲ حکام اپنے "فری رہائشی ٹیلی فونز" سے سالانہ ڈیڑھ لاکھ روپے کی کالیں کرتے ہیں۔

- ۱۹۵۸ء سے اب تک یہ افسر سرکاری خزانے کو ۱۵ لاکھ ۷۹ ہزار دو سو روپے کا نقصان پہنچا چکے ہیں۔
- ۹۶ افسروں کے گھروں پر ناجائز اور غیر قانونی ٹیلی فونز لگے ہوئے ہیں۔
- ایک اسسٹنٹ انجینئر نے چھ ماہ میں دو ہزار ۷۹۶ روپے ۱۵ پیسے کے میڈیکل بل وصول کیے۔
- ڈویژنل انجینئر، ٹھیکیداروں سے گٹھ جوڑ کر کے جعلی بلوں پر ادائیگیاں کرتے ہیں۔

یہ انکشافات افواہوں پر مشتمل نہیں ٹھوس حقائق ہیں۔ محکمہ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے بارے میں عرصہ دراز سے عوام کو یہ شکایت ہے کہ ٹیلی فون لگوانے کے لیے دو دو تین تین سال تک "ٹیلی فون ہاؤس" کے چکر لگانے پڑتے ہیں ہر مرتبہ کیبل نہ ہونے کا بہانہ بنایا جاتا ہے۔ "تنگیٔ داماں" کا عذر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں، وکیلوں اور اخبار نویسوں ایسے اہم فرائض انجام دینے والوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ ہر بار حکام سے یہی جواب ملتا ہے "آپ فکر کیوں کرتے ہیں، آپ کا نام ترجیحی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جیسے ہی کیبل دستیاب ہوا ٹیلی فون لگا دیا جائے گا۔" لیکن کیبل ڈیڑھ دو سال تک "دستیاب" نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس محکمہ ٹیلی فون کے ایسے افسروں کو جن کا آؤٹ ڈور ڈیوٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور جن کے فرائض دفتر تک ہی محدود ہوتے ہیں، ٹیلی فون مہیا کر دیئے جاتے ہیں خواہ اس کے لیے نیا کیبل ہی ڈالنا پڑے۔ محکمہ کے افسروں کے بعد طوائفوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جب یحییٰ اسکینڈل منظر عام پر آیا تو معلوم ہوا کہ کئی طوائفوں کے ہاں پانچ پانچ ٹیلی فون لگے ہوتے ہیں جبکہ مستحق افراد ایک ٹیلی فون کے لیے ترس رہے ہیں۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کی آڈٹ پارٹی ٹیلی فون ریویو نے اپنی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا کہ محکمہ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے ایسے ۱۳۲ افسروں کے گھروں پر فری ٹیلی فون لگے ہوئے ہیں۔ جن کے فرائض دفتر تک محدود ہیں اور ایمرجنسی ڈیوٹی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ افسر اپنے نجی کاموں کے لیے اس سرکاری ٹیلی فون کو استعمال کرتے ہیں

درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین کو بے ایمان اور جھوٹا سمجھا جاتا ہے

لاہور، ملتان، پشاور، پنڈی اور اسلام آباد میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو اکثر و بیشتر ٹرنک کالیں کرتے ہیں کام تو ذاتی ہوتا ہے لیکن اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کیے جاتے ہیں جس کا سالانہ خرچ ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ آڈٹ رپورٹ کے مطابق ان ۱۳۲ افسروں میں تیرہ ڈائریکٹر، چھ اسسٹنٹ ڈائریکٹر، پانچ اسسٹنٹ ڈپٹی ڈائریکٹر، تین چیف انجینئر، چھ ڈپٹی چیف انجینئر، اٹھارہ ڈویژنل انجینئر، بیس اسسٹنٹ انجینئر، گیارہ اکاؤنٹس آفیسر، ایک ایڈمنسٹریٹو آفیسر، چار پروگرام آفیسر، چار ویلفیئر آفیسر، تین افسر رابطہ، تین سیکرٹری، چودہ سپرنٹنڈنٹ، چودہ پرائیویٹ سیکرٹری اور دو اکاؤنٹنٹ ہیں۔

آڈٹ پارٹی ریویو نے مشورہ دیا ہے کہ ان افسروں کے فرائض دفتر تک محدود ہیں اس لیے انہیں فری رہائشی ٹیلی فون نہیں دیئے جائیں کیونکہ یہ نجی کاموں کے لیے ٹیلی فونز استعمال کرتے ہیں اور ۱۹۵۸ء سے اب تک ۱۵ لاکھ ۷۹ ہزار دو سو روپے کی کالیں کر چکے ہیں۔ رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ اگر یہ ٹیلی فونز ڈاکٹروں، وکیلوں اور دیگر افراد کو دیئے جاتے تو حکومت کی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا۔

آڈٹ پارٹی ریویو نے اپنی دوسری رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ محکمہ ٹیلی فون کے اعلیٰ حکام نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے ۹۴ افسروں کو ناجائز اور غیر قانونی طور پر فری رہائشی ٹیلی فونز مہیا کیے ہیں۔ محکمہ کا قانون یہ ہے کہ ٹیلی فون لگانے کے لیے حکم جاری کیا جاتا ہے۔ ایڈوانس نوٹ ایس ڈی او کو بھیجا جاتا ہے جو اس پر عمل درآمد کرتا ہے۔ لیکن بعض اوقات حکام ایڈوانس نوٹ جاری نہیں کرتے، زبانی طور پر ٹیلی فون لگانے کا حکم جاری کر دیتے ہیں جو قطعی طور پر ناجائز اور غیر قانونی ہوتے ہیں۔ آڈٹ پارٹی ریویو نے اپنی رپورٹ میں ایسی دو مثالیں پیش کی ہیں۔ ڈویژنل انجینئر حیدر آباد نے ایڈوانس نوٹ جاری کیے بغیر ایک انجینئر سپروائزر اور ایک ڈویژنل اکاؤنٹنٹ کے گھر پر فری ٹیلی فون لگوا دیئے۔ انجینئر سپروائزر نے ایک سال میں ۸۱۳ روپے اور ڈویژنل اکاؤنٹنٹ نے چھ ہزار ۲۲۹

میڈیکل فنڈ کا ۹۵ فیصد - افسروں کی جیب میں

روپے کی کالیں کیں۔ جب آڈٹ پارٹی نے اکاؤنٹس آفیسر ٹیلی فون ریونیو کو اس غلطی سے آگاہ کیا تو اس نے ڈویژنل انجینئر حیدرآباد سے رجوع کیا۔ ڈویژنل انجینئر نے اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کی بجائے صرف اس وعدہ پر ٹرخا دیا کہ وہ عنقریب ایڈوائس نوٹ جاری کر دے گا۔ لیکن یہ بتانے کی زحمت گوارہ نہ کیا کہ اس نے اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ کیوں اٹھایا؟

جن ۹۴ افسروں کے گھروں پر ناجائز اور غیر قانونی فری ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ ان میں پندرہ اسسٹنٹ ڈپٹی ڈائریکٹر، تیرہ اسسٹنٹ انجینئر، چھ ڈپٹی چیف انجینئر، پانچ اسسٹنٹ چیف انجینئر، دو اسسٹنٹ ڈائریکٹر، چودہ اکاؤنٹس آفیسر، تیرہ ہیڈ اسسٹنٹ اور آفس سپرنٹنڈنٹ، سولہ پرسنل اسسٹنٹ، دو ویلفیئر آفیسر، ایک سیکورٹی افسر، تین افسر رابطہ، ایک ایڈمنسٹریٹو آفیسر اور دو اکاؤنٹنٹ شامل ہیں۔

آڈٹ ریونیو پارٹی نے اپنی رپورٹ میں سوال اٹھایا ہے کہ جب دوسرے محکموں میں پرسنل اسسٹنٹ، سیکشن آفیسر، ویلفیئر آفیسر اور اکاؤنٹس آفیسر کو فری رہائشی ٹیلیفون نہیں دیا جاتا تو محکمۂ ٹیلی فون میں کیوں دیا جاتا ہے؟ اس سلسلے میں آڈٹ پارٹی نے چند اہم محکموں کی مثالیں دی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

صدارتی سیکرٹریٹ

۱۔ سیکرٹری کے پرسنل اسسٹنٹ
۲۔ ڈائریکٹر جنرل کے پرسنل اسسٹنٹ
۳۔ پلاننگ ڈویژن کے پرسنل اسسٹنٹ

وزارتِ زراعت

۱۔ ایڈمنسٹریٹو آفیسر

کیبنٹ سیکرٹریٹ

۱۔ سیکشن آفیسر
۲۔ ویلفیئر آفیسر

پاکستان آڈٹ ڈیپارٹمنٹ

۱۔ ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل
۲۔ اکاؤنٹس آفیسر

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی

۱۔ ویلفیئر آفیسر
۲۔ اسسٹنٹ انجینئر اور سب ڈویژنل آفیسر

حکومتِ سندھ

۱۔ گورنر کے پرسنل اسسٹنٹ
۲۔ سیکرٹری
۳۔ گورنر کے پرائیویٹ سیکرٹری
۴۔ چیف سیکرٹری کے پرائیویٹ سیکرٹری

مندرجہ بالا آفیسروں کو فری رہائشی ٹیلیفون نہیں دیئے گئے۔

میڈیکل بل

محکمۂ ٹیلی فون کے حکام میڈیکل بل کے ذریعے بھاری رقم وصول کرنے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین کو جو جسم و جان کا رشتہ بھی بمشکل برقرار رکھتے ہیں طبی سہولتیں حاصل نہیں۔ جب وہ میڈیکل بل پیش کرتے ہیں تو انہیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔

یاد ش بخیر چند سال قبل گارڈن ٹیلی فون ڈویژن میں مسٹر نذیر احمد ڈویژنل انجینئر ہوتے تھے۔ انہوں نے درجہ سوم اور چہارم کے ملازم کے لیے یہ لازمی قرار دیا کہ وہ میڈیکل بل کے ساتھ دوائیاں بھی پیش کریں۔ وہ خود اپنے ہاتھ سے بوتل کی سیل توڑتے تھے۔ کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ درجہ سوم اور چہارم کے "ملازمین" بے ایمان اور جھوٹے" ہوتے ہیں۔ وہ ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔ جب وہ دوائی اور بل دیکھ لیتے تو بل اکاؤنٹس برانچ کو بھیج دیا جاتا جو چھ سات ہفتے تک پڑا رہتا۔ بل دینے والے کو بار بار اکاؤنٹنٹ اور اکاؤنٹس کلرک کی خوشامد کرنی پڑتی ہے اور بل پاس ہونے کے بعد خازن کے در پر حاضری دینی پڑتی تھی۔ جتنی زحمت اور وقت بل پاس کروانے میں اٹھانی پڑتی ہے اتنے کا بل نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس ڈویژنل انجینئروں، سب ڈویژنل آفیسروں اور اسسٹنٹ انجینئروں کو بالکل چھوٹ ملی ہوئی ہے جب کہ وہ اپنی تنخواہ سے زیادہ کا میڈیکل بل پیش کرتے ہیں۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ محمد رفیق اسسٹنٹ انجینئر جنکشن

بل کی رقم	بل کی ادائیگی کے حکم نامہ کا نمبر اور تاریخ
۴۵۹-۱۰	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۷۸ مورخہ
۴۰۸-۴۰	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۷۹ ″
۲۵۸-۱۰	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۸۰ ″
۲۵۱-۵۰	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۸۱ ″
۲۸۲-۶۰	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۹۲ مورخہ
۴۱۱-۵۵	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۹۶ ″
۴۲۴-۹۰	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۱۰۲ ″
۲۶۹۷-۱۵	

۲۔ سید واجد حسین سب ڈویژنل آفیسر ناظم آباد

بل کی رقم	بل کی ادائیگی کے حکم نامہ نمبر اور تاریخ
۱۹۹-۴۷	اے-۱۳/این زیڈ ڈی/جی ایم/۷۷ مورخہ
۱۹۷-۵۶	اے-۱۳/این زیڈ ڈی/جی ایم/۷۹ ″
۳۵۹-۴۲	اے-۱۳/این زیڈ ڈی/جی ایم/۸۱ ″
۲۰۱-۴۶	اے-۱۳/این زیڈ ڈی/جی ایم/۸۳ ″
۲۰۳-۷۶	اے-۱۳/این زیڈ ڈی/جی ایم/۸۶ ″
۴۸-۳۱	اے-۱۳/این زیڈ ڈی/جی ایم/۹۲ ″
۱۹۹-۵۲	اے-۱۳/این زیڈ ڈی/جی ایم/۹۴ ″
۱۳۴-۳۸	اے-۱۳/این زیڈ ڈی/جی ایم/۹۹ ″
۱۹۱۲-۵۴	

۳۔ ایس ایم ایچ کاظمی۔ اسسٹنٹ انجینئر فونز جنکشن

بل کی رقم	بل کی ادائیگی کے حکم نامہ نمبر اور تاریخ
۵۰۲-۹۱	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۶۱ مورخہ
۳۰۷-۴۴	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۷۱ ″
۳۰۰-۴۱	اے-۱۳/جی ایم/ویلسٹ/۹۳ ″
۱۱۱۰-۷۶	

۴۔ محمد صفدر مرزا سب ڈویژنل آفیسر

بل کی رقم	بل کی ادائیگی کے حکم نامہ نمبر اور تاریخ
۹۴-۷۰	اے-۱۳/جی ایم/ساؤتھ/۹۳ مورخہ
۱۷۰-۸۲	اے-۱۳/جی ایم/ساؤتھ/۱۰۱ ″

۲۰۶-۸۹	اے-۱۳/جی ایم/ساؤتھ/۱۱۶ ۹/۹/۷۱
۱۹۵-۸۹	اے-۱۳/جی ایم/ساؤتھ/۱۱۷ ۹/۹/۷۱
۶۶۸-۳۰	

۵- محمد اصغر خان اسسٹنٹ انجینئر فونز

بل کی رقم	بل کی ادائیگی کے حکم نامہ نمبر اور تاریخ
۳۰۵-۲۲	اے-۱۳/جی ایم/ویسٹ/۹۴ مورخہ ۱۵/۹/۷۱
۳۶۲-۳۰	اے-۱۳/جی ایم/ویسٹ/۱۰۳ ۱۵/۹/۷۱
۶۶۷-۵۲	

۶- آئی اے خرم سب ڈویژنل آفیسر

بل کی رقم	بل کی ادائیگی کے حکم نامہ نمبر اور تاریخ
۱۵۹-۵۸	اے-۱۳/جی ایم/ویسٹ/۹۹ مورخہ ۱۵/۹/۷۱
۳۱۳-۲۳	اے-۱۳/جی ایم/ویسٹ/۱۰۰ ۱۵/۹/۷۱
۱۵۹-۲۱	اے-۱۳/جی ایم/ویسٹ/۱۰۵ ۱۵/۹/۷۱
۶۳۲-۲	

۷- غلام حسین اسسٹنٹ انجینئر فونز

بل کی رقم	بل کی ادائیگی کے حکم نامہ نمبر اور تاریخ
۸۷-۰۲	اے-۱۳/جی ایم/ساؤتھ/۹۵ مورخہ ۶/۳/۷۱
۱۹۸-۱۱	اے-۱۳/جی ایم/ساؤتھ/۹۷ ۱۷/۵/۷۱
۱۱۴-۴۵	اے-۱۳/جی ایم/ساؤتھ/۱۰۶ ۲۶/۶/۷۱
۳۹۹-۵۸	

یہ تو صرف چند مثالیں ہیں۔ اگر اس کی تفصیل میں جایا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میڈیکل بجٹ ۹۵ فیصد آفیسروں پر خرچ ہوتا ہے۔

ڈویژنل انجینئروں کی دھاندلیاں

قانون یہ ہے کہ جب کوئی سامان خریدنا ہو یا ٹھیکہ پر کوئی کام کروانا ہو تو سربمہر ٹنڈر منگوائے جاتے ہیں۔ جس کا ٹنڈر سب سے کم مالیت کا ہو ٹھیکہ اسے دیا جائے لیکن محکمہ ٹیلیفون کے اکثر ڈویژنل انجینئروں کے اپنے منظورِ نظر ٹھیکیدار ہیں۔ ان ہی کو ٹھیکے دیئے جاتے ہیں۔ حکومت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ان ٹھیکیداروں نے مختلف کمپنیاں بنا رکھی ہیں لیکن تمام کمپنیوں کا مالک ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ انکم ٹیکس ضابطہ ۱۹۶۰ء کے تحت لازمی ہے کہ ٹھیکے دار کو بل کی ادائیگی بذریعہ کراس چیک کی جائے۔ لیکن اکثر اوقات ٹھیکیداروں کو نقد بل کی ادائیگی کی جاتی ہے اور بعض مرتبہ سب ڈویژنل افسروں اور اسسٹنٹ انجینئروں کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ عارضی ایڈوانس سے ٹھیکیدار کے بل کی ادائیگی کر دیں جو سراسر خلاف قانون ہے۔

صارفین کے بل

محکمہ ٹیلی فون کی "کارکردگی" سے عوام کو ایک عرصہ سے جن مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا ہے۔ ان سے بارہا متعلقہ حکام کو مطلع کیا گیا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس محکمہ کے حکام عوامی شکایات کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ عام شکایت یہ ہے کہ محکمہ کی جانب سے صارفین کو جو بل بھیجے جاتے ہیں وہ اکثر غلط اور فی الواقعہ واجب الادا رقم سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں موجود ہیں کہ کسی صارف کو بل عموماً پچاس روپے آتا تھا لیکن اچانک یہ رقم پچاس سے بڑھ کر دو سو روپے ہو گئی اور بعض اوقات تو ہزاروں تک پہنچ گئی اور جب سے سبسکرائبر ٹرنک ڈائلنگ (ایس ٹی ڈی) کا نظام رائج ہوا ہے شکایات میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اس کی کئی وجوہات ہیں۔ بعض اوقات بدعنوانی یا بدنیتی کے سبب ایک کا ٹیلی فون دوسرے سے ملا دیا جاتا ہے جس کے سبب اول الذکر کی تمام کالیں دوسرے کے حساب میں ڈال دی جاتی ہیں اور یوں چند کالوں کی بجائے ہزاروں کالوں کا بل صارف سے وصول کر لیا جاتا ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ محکمہ ٹیلی فون نے اپنے دفاتر کے ٹیلی فونز سے ایس ٹی ڈی کا نظام ختم کر دیا ہے۔ ان سے براہ راست حیدرآباد، لاہور اور پنڈی سے بات نہیں کی جا سکتی۔ محکمہ ٹیلی فون کے ملازمین یا ان کے احباب کو جب حیدرآباد، لاہور اور پنڈی سے بات کرنی ہوتی ہے تو وہ اپنی جیب سے رقم خرچ کرنے یا ٹرنک ڈویژن کے کسی ملازم کا احسان لینے کی بجائے ایم۔ ڈی ایف روم سے جہاں ہر ٹیلی فون کا کنکشن ہوتا ہے کسی بھی صارف کے کنکشن سے ریسیور لگا کر حیدرآباد، لاہور اور پنڈی بات کر لیتے ہیں۔ یہ باتیں بہت طویل ہوتی ہیں کیونکہ اپنی جیب سے تو پیسے ادا کرنے نہیں ہوتے۔ اس طرح کی سب کالیں صارف کے کھاتے میں جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صارف کو ہزاروں روپے کا بل وصول ہوتا ہے جو اس کے اوسان خطا کر دیتا ہے۔

برِصغیر میں بڑی طا...

ایک ہولناک...



پاکستان عالمی امن کے قیام میں اپنا تاریخی کردار انجام دے گا

پاکستان کے خلاف سامراجی ممالک کی تائید و حمایت اور روسی ساز و سامان کے بل پر شرمناک جارحیت کے ارتکاب کے بعد بھارتی سیاستدانوں، خاص طور پر وزیرِ خارجہ سردار سورن سنگھ اور وزیرِ دفاع جگ جیون رام کی طرف سے امن کی پیش کش اپنی مضحکہ خیزی کے باوجود قابلِ غور ہے۔ جارحیت کے بعد امن کی پیش کش سامراجیوں کا پرانا دستور ہے موجودہ دور میں آگ اور خون کا ڈرامہ کھیلنے کے بعد روس کی طرف سے ہنگری کے عوام کو امن کی پیش کش اور اس کا مفہوم دنیا کے آزادی پسند عوام کی نظروں سے پوشیدہ نہیں چنانچہ بھارت کی طرف سے بھی پاکستان کو امن کی پیش کش ان حالات میں قابلِ غور ہے جبکہ بھارتی فوجیں روسی اسلحہ سے لیس پاکستان پر حملہ کے لیے تیار کھڑی ہیں اور بھارتی وزیرِ اعظم مغربی پاکستان کی سرحدوں میں تبدیلی کا مطالبہ کر چکی ہیں۔ آکاش وانی کا پاکستان کی سالمیت کو پارہ پارہ کر دینے کا پراپیگنڈہ بھی زور شور سے جاری ہے اور پاکستان کو یک و تنہا کر دینے کی کوششیں بھی۔

ان حالات میں بھارتی وزیرِ اعظم کا یہ بیان کہ برصغیر کے اس المیے کی تمام تر ذمہ داری بڑی طاقتوں کی توازنِ طاقت کے نظریے کے تحت آپس کی رسہ کشی پر ہے، ایک متضاد کیفیت کا حامل نظر آتا ہے کیونکہ ہمسایہ ممالک کے خلاف یہ بھارت کی ریشہ دوانیاں ہی تھیں جن کے سبب سامراجی طاقتوں کو برصغیر کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا موقع ملا۔ چنانچہ اولاً چین کے خلاف امریکہ سے اور پھر پاکستان کے خلاف روس سے فوجی معاہدہ بھارت کی عاقبت نااندیشانہ روش کی نشاندہی کرتے ہیں۔

بھارت کی غلط خارجہ حکمت عملی کا ہی نتیجہ ہے کہ آج بحرِ ہند سولہویں اور سترھویں صدی کے یورپی بحری قزاقوں کی آپس کی رسہ کشی کا منظر پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ آج بحرِ ہند امریکہ، روس اور برطانیہ کے بحری جہازوں کی بازی گاہ بنا ہوا ہے۔ بھارت کے بحری اڈوں پر روس کے قدم جم چکے ہیں اور برطانیہ مشرقی پاکستان کے جوٹ اور چائے کا اجارہ دار بن کر یورپ کی مشترکہ منڈی میں اپنا اقتصادی مستقبل تابناک بنانے کی فکر میں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بھارت کی منفی خارجہ پالیسی نے ایک بار پھر برصغیر کو دنیا کی مختلف سامراجی طاقتوں کی رسہ کشی اور زور آزمائی کا اکھاڑہ بنا کر سالہا سال کے لیے اس علاقے کے امن و امان کو طوفان کی نذر کر دیا ہے۔

دراصل بھارتی وزیرِ اعظم کا بڑی طاقتوں کے خلاف غم و غصہ بھارتی خارجہ حکمت عملی کے اس شدید بحران کی نشاندہی کرتا ہے جو اپنے متضاد افکار و نظریات کی پیداوار ہے بھارتی حکمت عملی میں اگر ایک طرف ہم کو سرمایہ دارانہ معیشت کے سبب سامراجی عزائم ملتے ہیں تو دوسری طرف سامراجی ممالک کی تائید و حمایت سے ہمسایہ ممالک کے خلاف مکروہ سازشوں میں فرقہ پرست عناصر! بھارتی خارجہ حکمت عملی ایک خطرناک راستے پر گامزن ہے جس کی قیمت برصغیر کے عوام کو آگ اور خون کی صورت میں ادا کرنی ہوگی۔ بھارت کی خارجہ حکمت عملی کے اس بنیادی تضاد کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس حکمت عملی کے بنیادی عوامل و محرکات کو ان کے تاریخی پس منظر میں سمجھنا ضروری ہے۔ بھارت کی موجودہ خارجہ پالیسی کے معمار پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ پنڈت نہرو نے برسرِ اقتدار آنے سے بہت پہلے اپنی مشہور تصنیف "ہندوستان کی دریافت" میں اس خارجہ پالیسی کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے جو چیز قاری کے ذہن کو خاص طور سے متاثر کرتی ہے وہ پنڈت نہرو کا بھارت کے لیے ایشیائی ممالک کی قیادت حاصل کرنے کا خواب ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کتاب میں ایشیائی ممالک پر عموماً اور ہمسایہ ممالک پر خصوصاً بھارت کا اثر و نفوذ قائم کرنے کا تصور بھی شامل ہے۔ چنانچہ بھارت کی موجودہ خارجہ پالیسی کو ہم پنڈت نہرو کے اس خواب کا عکس کہہ سکتے ہیں جو انہوں نے "ہندوستان کی دریافت" میں دیکھا تھا۔

پنڈت نہرو کا خاندانی تعلق کشمیر سے اور سیاسی تعلق انڈین نیشنل کانگریس سے تھا۔ کانگریس کی بنیاد ایک انگریز نے برطانوی حکومت کی حکمت عملی کی تائید و حمایت کے لیے رکھی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد قوم پرست عناصر بھی کانگریس میں شامل ہو گئے۔ ان عناصر کی شرکت کے بعد کانگریس کا سیاسی مطمعِ نظر برطانیہ کے زیرِ سرپرستی حقِ خود اختیاری کا حصول بن گیا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ہندوستانی سرمایہ دار بھی اس پارٹی میں شامل ہونا شروع ہو گئے اور اپنی مالی اعانت کے طفیل کانگریس کے کلیدی عہدوں پر قابض ہو گئے۔

ہندو سرمایہ دار جن کی ابتدا ایسٹ انڈیا کمپنی کے گماشتے اور دلال کی حیثیت سے ہوئی تھی، اب اپنی اس لوٹی ہوئی دولت کی بدولت، جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں سے گٹھ جوڑ کے سبب ان کے ہاتھ آئی تھی، ملوں اور کارخانوں کے مالک بن گئے تھے۔ یہ ہندو سرمایہ دار اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے سخت پریشان تھے۔ کیونکہ ہندوستانی مصنوعات اپنے پست معیار اور حکومت کی مخاصمت کے سبب خاطر خواہ طریقے پر فروخت نہ ہو پاتی تھیں۔ چنانچہ ہندو سرمایہ دار نے کانگریس کو اپنی مالی اعانت کے عوض بدیشی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی مال کی سرپرستی کی ترغیب دی۔ انڈین نیشنل کانگریس میں بدیشی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی مال کی سرپرستی کی تحریک کے سب سے بڑے داعی پنڈت نہرو کے سیاسی پیشوا گاندھی جی تھے۔

بدیشی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی مال خریدنے کی تحریک برطانوی حکومت کی سخت گیری کے سبب کامیاب نہ ہو سکی۔ ہندو سرمایہ دار کو یقین ہو گیا کہ یہ تحریک اس وقت تک کامیاب نہ ہو سکے گی جب تک کہ دوسرے ممالک کی درآمد

...سے برصغیر کا امن تہ و بالا ہوگیا

...ں کی سیاسی کش مکش

...نگ کا پیش خیمہ

...جعفری

"حالیہ المیے کی ذمہ داری بڑی طاقتوں پر ہے"

اندرا گاندھی کا اعتراف



شدہ مصنوعات پر مکمل پابندی عائد نہیں ہو جاتی۔ برآمدات پر مکمل پابندی برطانوی حکومت کی موجودگی کے سبب ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ اب ہندو سرمایہ دار نے بھی اپنی سرمایہ دارانہ اغراض کے تحت کانگریس کے اسی طبقے کی ہمنوائی شروع کردی جو کہ دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے مکمل آزادی کا طالب تھا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کلیدی صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں اور ان صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا بیشتر حصہ فوجی خدمات کے سبب ملک سے باہر تھا۔ ان حالات میں برطانیہ کے سامنے صرف یہی صورت باقی تھی کہ وہ اپنی نوآبادیوں کو آزاد کر کے فوجیوں کو واپس بلالے تاکہ وہ صنعتی پیداوار میں مصروف ہو جائیں چنانچہ ان حالات کے تحت برطانیہ کو برِصغیر کی آزادی بھی تسلیم کرنی پڑی۔

ہندوستان کی آزادی سے ہندو سرمایہ دار کی دلی مراد پوری ہو گئی لیکن برصغیر کے مسلمانوں کی ہندو سرمایہ دار کے معاشی شکنجے سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آگیا۔ ہندو سرمایہ دار نے بادل نخواستہ برصغیر کی تقسیم کو قبول تو کر لیا مگر وہ بارہ کروڑ نفوس پر مشتمل منڈی اور یہاں کے خام مال مثلاً جوٹ، روئی وغیرہ پیدا کرنے والے علاقے کو دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں برابر مصروف رہا۔ یہی حال برطانوی سرمایہ دار کا بھی تھا۔ برطانوی سرمایہ دار نے اپنی معاشی مجبوریوں کے سبب برصغیر کی آزادی کو تسلیم تو کر لیا مگر اسی عظیم منڈی پر دوبارہ اپنی معاشی گرفت قائم کرنے کے لیے درپردہ سازشوں میں آج تک مصروف ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا سیاسی شعور اسی دور میں بیدار ہوا جب کہ بدیشی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی مال کی سرپرستی کی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں۔ چنانچہ پنڈت نہرو سوشلسٹ نظریات کے حامی و مبلغ ہونے کے باوجود اپنا ذہنی تعلق کانگریس کے سیاسی و معاشی نظریات و پس منظر اور اپنی خاندانی روایات سے آخر تک منقطع نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کی وضع کردہ خارجہ پالیسی کے عناصرِ ترکیبی وہی سرمایہ دارانہ نظریات ہیں۔ جن کا مبلغ آدم سمتھ تھا۔ چنانچہ بھارت کے حلقۂ اثر کی ایشیا میں توسیع ایشیائی ممالک کی قیادت کا تصور، بحرِ ہند پر تسلط سرمایہ داری کے ان قدیم نظریات سے ماخوذ نظر آتا ہے جس کا مطمع نظر فاضل مصنوعات اور سرمائے کے لیے غیر ملکی منڈیوں پر تسلط، اقتدار اور اجارہ داری ہے۔

پنڈت نہرو جب تک زندہ رہے اپنے افکار و نظریات کی اشاعت اور ان کو عملی صورت دینے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ چنانچہ جوناگڑھ، مانادور، حیدر آباد اور کشمیر کے خلاف فوجی جارحیت اور ایشیائی ممالک کی قیادت حاصل کرنے کی ان تھک کوششیں، بھارت کی سرمایہ دارانہ توسیع پسندی کی کوششوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

ایشیائی ممالک کی قیادت حاصل کرنے کے لیے بھارت کی راہ میں دو ممالک حائل تھے۔ اول عوامی جمہوریہ چین جو کہ جغرافیائی اعتبار سے ایشیا کا قائد ہے اور دوئم پاکستان جس کا مطمع نظر اپنے اسلامی افکار و نظریات کے سبب مسلم ممالک پر مشتمل ایک بلاک کی تنظیم و قیادت تھا۔ چنانچہ حالات و واقعات کے تحت چین اور پاکستان کا پنڈت نہرو کے نظریات سے اختلاف ایک منطقی نتیجہ تھا۔ چیانگ کائی شک کے دور میں پنڈت نہرو کو یقین تھا کہ چین اپنے اندرونی خلفشار کے سبب ایک طویل عرصے تک ایشیائی ممالک کی قیادت کا اہل نہ ہو سکے گا۔ اور لازمی طور پر چین کی غیر موجودگی میں ایشیائی ممالک کی قیادت کا حق بھارت کو حاصل ہے۔ پنڈت نہرو کے اسی نظریے سے اسی دور میں امریکہ اور برطانیہ کے سیاستدان بھی متفق تھے اور یہی سبب ہے کہ انہوں نے پنڈت نہرو کی ایشیائی ممالک کی قیادت حاصل کرنے کی کوششوں کی مکمل طور پر تائید و حمایت کی۔ لیکن بھارت کی توقعات کے خلاف ۱۹۴۹ء میں ماؤزے تنگ کی زیرِ قیادت چین میں کمیونسٹ برسرِ اقتدار آگئے انہوں نے چیانگ کائی شک کی حکومت کو فارموسا میں دھکیل دیا۔ چین میں کمیونسٹوں کے برسرِ اقتدار آجانے کے سبب امریکہ اور برطانیہ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیونکہ ان دونوں ممالک کو توقع تھی کہ جاپان کی شکست کے بعد چین ان کی مصنوعات کی فروخت کے لیے بہت بڑی منڈی ثابت ہوگا۔ چین کو منڈی بنانے کی امریکی اور برطانوی امیدیں تو کمیونسٹوں کے برسرِ اقتدار آتے ہی ختم ہو گئیں۔ لیکن بھارت نے اس امید پر چین سے تعلقات قائم رکھے کہ چین کو اپنی گھریلو ضروریات کی کفالت کے لیے ایک صنعتی ملک میں تبدیل ہونے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہے اس لیے ایک طویل عرصہ تک چین میں بھارتی مصنوعات کی مانگ رہے گی۔

بھارتی امیدوں کے برعکس چین بہت جلد ایک صنعتی ملک بن کر اپنی ضروریات کا کفیل ہو گیا اور بھارتی مصنوعات کے لیے چین کے دروازے بند ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ چین نے ایشیائی ممالک میں اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کی کوششیں تیز تر کر دیں۔ فطرتاً امریکہ اور برطانیہ نے چین کی ایشیائی ممالک کی قیادت حاصل کرنے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے پنڈت نہرو کی پشت پناہی شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ پنڈت نہرو نے مسلم ممالک میں اپنا سفارتی جال بچھا کر کوشش کی کہ پاکستان کسی قیمت پر بھی مسلم بلاک قائم کرنے یا مسلم ممالک کی قیادت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

امریکہ کی شہ پر بھارت نے تبت پر اپنا اثر و نفوذ اور معاشی اجارہ داری قائم رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ جنوبی چین کو بھارت سے ملانے والا انتہائی اہم راستہ تبت میں واقع درہ سیلا سے ہو کر گزرتا ہے اور یہ راستہ چین کی زندگی میں شہ رگ کی حیثیت

امریکہ، برطانیہ اور بھارت کی مُسلم بلاک کے خلاف ریشہ دوانیاں



رکھتا ہے۔ چنانچہ تبت پر اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے بھارت نے ہمالیہ کی فوجی چوکیوں کو مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ بھارت نے تبت کے دلائی لامہ کو بھی اپنے زیرِ اثر لے کر تبت میں جاسوسی کا جال پھیلانا شروع کر دیا صرف یہی نہیں۔ بھارت نے کئی جگہ سے میکموہن لائن کو بھی پار کر لیا۔ ان حالات میں چینی فوجیں بھی مقابلہ کے لیے آ گئیں اور انہوں نے ہمالیہ میں بھارتی فوجوں کو زبردست شکست دے کر تبت پر اپنا تسلّط دوبارہ قائم کر لیا۔ دلائی لامہ تبت سے فرار ہو کر بھارت کی پناہ میں آ گیا۔ چین نے بھارت کے خطرناک ارادے دیکھتے ہوئے تبت تک ایک پختہ سڑک تعمیر کر کے تبت کی داخلی تجارت کا رُخ چین کی طرف موڑ لیا۔

اسی دوران بھارت اور امریکہ کا وہ خفیہ فوجی معاہدہ بھی بے نقاب ہو گیا جس کے تحت امریکہ نے چین کے خلاف جارحیت کی پشت پناہی کے لیے بھارت کی بے تحاشا فوجی سامان اور نقد روپے سے مدد کی۔ اس خفیہ فوجی معاہدے کے طشت ازبام ہونے کے بعد یہ راز کھلا کہ امریکہ بھارت کی کثیر آبادی سے چین کی افرادی قوت کا توازن کرنا چاہتا ہے اور یہی سبب تھا جس نے امریکہ کو مجبور کیا کہ ہمالیہ میں چین کے ہاتھوں بھارت کی شکست کے باوجود بھارت کی مالی اور فوجی امداد جاری رکھے۔

اس کے ساتھ ساتھ بھارت، امریکہ اور برطانیہ نے یہ کوششیں بھی جاری رکھیں کہ پاکستان کسی طور بھی مسلم بلاک کی تشکیل میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بھارت نے تو یہ کام سفارتی سطح پر انجام دیا اور امریکہ نے پاکستان سے اپنے فوجی معاہدہ کے بل پر۔ فوجی معاہدے کے ذریعے امریکہ پاکستان کے سیاہ و سفید پر اس قدر حاوی ہو گیا کہ اس نے اپنے سفارتی جال کے ذریعے مسلم بلاک کی تشکیل کی راہ میں سینکڑوں دشواریاں حائل کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں پاکستان امریکہ کے سفارتی مشوروں اور بھارت کے مسلم ممالک میں جوڑ توڑ کے سبب مسلم بلاک کی تشکیل سے دور ہو کر تنہا رہ گیا۔ امریکہ کو خوف تھا کہ اگر مسلم بلاک وجود میں آ گیا تو مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیلی حکومت کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے گا اور نتیجے میں امریکہ کے تیل کے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔

چین سے شکست کھانے کے بعد بھارت کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک طویل عرصے تک چین سے فیصلہ کن جنگ کے قابل نہ ہو سکے گا اور اسی لیے اس کو اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے اپنی تمام تر توجہ اپنے پڑوسی ممالک کی طرف مبذول کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اب بھارت کی نظریں بھوٹان، نیپال، سیلون اور پاکستان پر پڑیں۔ ساتھ ہی ساتھ بھارت نے مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ بھوٹان کو تو بھارت نے براہِ راست اپنے زیرِ اثر لے لیا۔ نیپال میں اپنے خاص ایجنٹ سنگھ کے ذریعے کانگریس کی تحریک کو تشدد کے راستوں پر ڈالا۔ سیلون میں تامل تحریک کو فروغ دیا۔ برما اور ہند چینی میں ہندو تہذیب و تمدن کی نشاۃِ ثانیہ کا ڈھونگ رچایا اور پاکستان کو سفارتی بنیاد پر تنہا کرنے کی کوششوں کے ساتھ ہی ساتھ اندرونِ ملک علیٰحدگی پسندی کے رجحانات کی خفیہ طریقوں سے ہمت افزائی کی۔

ان حالات میں پاکستان کی وسیع منڈی پر بھارت کی نظریں پڑنا ایک لازمی امر تھا۔ پاکستان جوٹ، روئی، چائے اور اناج پیدا کرنے والے ممالک کی صفِ اول میں تھا۔ صرف جوٹ، چائے اور روئی سے اتنا زرِ مبادلہ کمایا جا سکتا تھا کہ بھارت کی بیشتر ضروریات کی کفالت کرتا۔ ساتھ ہی ساتھ پاکستان بھارتی مصنوعات کی ایک بڑی منڈی بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ چین میں داخلہ کے لیے تبت



بھارت نے روس کو اپنے بحری اڈے استعمال کرنے کی اجازت دیدی

کے بعد دوسرا اہم راستہ جو کشمیر کو سنکیانگ کے ذریعے چین سے ملاتا تھا، پاکستان کے قبضے میں تھا۔ بھارت ہر قیمت پر اس اہم رستے کی اجارہ داری حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔

مندرجہ بالا تجزیہ سے بھارت کی خارجہ پالیسی کے وہ خطوط واضح ہو جاتے ہیں جن کی بنیاد پر پنڈت نہرو نے بھارت کی خارجہ پالیسی وضع کی تھی اور جس پر آج بھی بھارتی سیاستدان گامزن ہیں۔

اس دوران چین اور روس کے نظریاتی اختلافات کھل کر سامنے آ گئے یہ اختلافات اس قدر شدید ہو گئے کہ اب روس نے چین کی فوجی ناکہ بندی کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ روس کے ترمیم پسندوں نے عوامی جمہوریہ چین کے خلاف وہ اقدامات شروع کر دیئے جن کی دنیا کو صرف امریکہ جیسے سرمایہ دار ملک سے توقع تھی۔ ایک طویل عرصے تک امریکہ سے فوجی اور اقتصادی امداد لینے کے بعد بھارت اور امریکہ کے تعلقات میں سرد مہری آنے لگی جس کا بنیادی سبب امریکہ کے دباؤ کے باوجود بھارت کا چین کے خلاف فوجی اقدام سے گریز تھا۔ بھارت ہمالیہ میں چین سے شکست کھانے کے بعد چین کی فوجی طاقت سے حد درجے خائف تھا مگر امریکی امداد سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا تاکہ اس فوجی امداد کو چین کے بجائے اپنے ہمسایہ ممالک بالخصوص پاکستان کے خلاف استعمال کر سکے ادھر روس کی مشرقِ بعید اور مشرقِ وسطیٰ میں قدم جمانے کی کوششیں امریکی مداخلت کے سبب ناکام ہو چکی تھیں۔ انڈونیشی بحریہ جس کی تنظیم روس نے کی تھی، روسی اثر سے نکل کر امریکہ کے زیرِ اثر جا چکی تھی۔ سیلون کے ساحلوں پر قدم جمانے کے لیے روسی کوششیں جو کہ روس نواز کمیونسٹوں کی بغاوت کی صورت میں رونما ہوئی تھیں، ناکامیوں سے ہمکنار ہو چکی تھیں۔ بحرِ ہند پر بدستور امریکہ کی اجارہ داری قائم تھی۔ بھارت کا ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر حملہ ناکام ہو چکا تھا اور فطرتاً بھارت کو ایک ایسے حلیف کی ضرورت تھی جو بھارت کے جارحانہ اقدامات کی تائید کرے۔

روس نہ صرف بحرِ ہند سے ہی امریکہ کے اثر کو زائل کرنے کی فکر میں تھا بلکہ مشرقِ بعید میں بھی چین کی موجودگی اور امریکہ کی مداخلت کا مؤثر حل تلاش کر رہا تھا فطرتاً چین

اور پاکستان سے دشمنی، امریکہ کے مدد یہ میں تبدیلی اور مشرق بعید کی سیاست میں بھارت کی دلچسپی بھارت اور روس کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ چنانچہ فوجی امداد کے عوض بھارت نے روس کی بحریہ کو اپنے ساحلوں پر بحری اڈے قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ کہا جا سکتا ہے کہ روس اور بھارت کا فوجی معاہدہ چین اور پاکستان کی دوستی کی پیداوار ہے۔

پاکستان کی بدقسمتی کہ اس دَور میں ملک پر فوجی آمریت مسلّط تھی۔ فوجی آمریت کے لیے ذاتی مسائل ہی اس قدر تھے کہ وہ ملکی مسائل کی طرف توجہ کیا دیتی؛ نتیجہ یہ ہُوا کہ پاکستان کی سفارتی سرگرمیاں فوجی آمروں کی ذاتی ضروریات تک محدود ہو کر رہ گئیں اور پاکستان بھارت کے سیاسی جوڑ توڑ کا حل دریافت نہ کر سکا۔ کہا جا سکتا ہے کہ بلاواسطہ طور پر فوجی آمریت نے بھارت کے وہ مسائل حل کر دیئے جو کہ وہ سفارتی سطح پر حل نہ کر سکا۔ ایک اچھے وزیر خارجہ کی ضرورت ہم نے اس وقت محسوس کی جب پاکستانی فوجیں مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال چکیں۔

بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ بندی کے بعد بھارت کو پاکستان کی طرف سے شدید ردّ عمل کا خوف تھا۔ بھارت کا یہ خوف اس وقت اور بھی شدید ہو جاتا ہے جب بھارتی سیاستدان یہ سوچتے ہیں کہ چین پاکستان کا بہترین دوست ہے اور امریکہ بحرِ ہند میں روس کی بحری اجارہ داری سے خائف! ان حالات میں ایک طرف پاکستان اور چین میں دوستی اور دوسری طرف امریکہ کا بحرِ ہند اور مشرق وسطیٰ میں روس سے خوف بھارت کے لیے خطرے کی علامت ہے۔ صدر نکسن کا دورۂ چین بھی روس اور بھارت کے لیے یکساں طور پر خطرے کا سبب بن سکتا ہے۔ دوسری طرف مسلم ممالک کی پاکستان کو غیر مشروط حمایت کی یقین دہانی اور بحرِ ہند میں انڈونیشیا کا طرزِ عمل بھارت کے لیے پریشان کن مسائل ہیں۔

ان حالات میں اگر برِّ صغیر اور بحرِ ہند بڑی طاقتوں کے درمیان رسّہ کشی کا اکھاڑہ بن جاتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں کیونکہ بڑی طاقتوں کو برِّ صغیر کے معاملات میں دخل اندازی کی دعوت بھارتی سامراجیوں نے دی تھی۔ بھارتی سیاستدان مستقبل قریب میں بھارت میں برپا ہونے والے طوفانوں سے خائف ہیں اور اس لیے وہ ایک طرف تو بڑی طاقتوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ان پر الزامات لگا رہے ہیں اور دوسری طرف پاکستان کو صلح کی پیش کش کر رہے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح آنے والے طوفان کا رُخ موڑا جا سکے۔

احمد ظفر قریشی

ابھی مِرا حوصلہ جواں ہے

مِرا بدن آتشِ ندامت سے جل چکا ہے
پگھل چکا ہے
مِرے بدن کی سپید رنگت
سیاہیوں میں بدل چکی ہے!
قبائے اطلس جو زیبِ تن تھی۔
وہ بے سلیقہ اُتر چکی ہے
مِری نگاہوں کی شوخیاں سب
پرائی آنکھوں میں جا بسی ہیں!
مِری زباں۔
میرے تیز دانتوں کے درمیاں پھنس کے کٹ چکی ہے
جمال چہرے کا ڈھل چکا ہے
شعور سکتے میں آگیا ہے
وجود دَم سادھ کر کھڑا ہے۔
میں شرم سے دوہرا ہوا ہوں۔
مگر مِرا حوصلہ ابھی تک
شکست کو جانتا نہیں ہے۔
حریفِ میداں کو مردِ میدان
اب بھی گردانتا نہیں ہے
ابھی مِرا حوصلہ جواں ہے
میں اپنے زخموں کو سی رہا ہوں۔
شکست کے داغ کو دھو رہا ہوں
میں تیغ کو آب دے رہا ہوں
حریفِ میداں کو ہاں خبر دو۔
کھلے سمندر، کھلی فضا میں
ابھی مِرا انتظار کرے۔
میں آ رہا ہوں، میں آ رہا ہوں۔

احتشام الحق تھانوی کے نام مبین ڈاہری کا خط

مجھے "ڈان" کا چیف ایڈیٹر بنایا جائے

شاھد

مولانا! آپ بڑے بڑے فتوے دیتے ہیں۔ ہر قسم کے فتوے دیتے ہیں۔ ہر موقع کے فتوے دیتے ہیں۔ مہربانی کرکے میرے لئے بھی ایک ایسا فتویٰ دیں کہ مجھے "ڈان" اخبار کا چیف ایڈیٹر بنا دیا جاؤں۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ جان و مال کو دعائیں دوں گا۔ ہزار روپے نذرانہ پیش کروں گا۔ بات یہ ہے مولانا۔ آج کل میں بہت پریشانی میں ہوں۔ جگہ جگہ پولیس سے چھپتا پھرتا ہوں۔ جنگلوں اور دلدلوں میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ پر پولیس کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ سائے کی طرح پیچھا کرتی ہے۔ چند دنوں سے میں جس جنگل میں رُوپوش ہوں۔ پولیس نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا ہے۔ یہ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ کئی بار پولیس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی۔ میرے کئی ساتھی مارے گئے۔ کچھ زخمی پڑے ہیں۔ کچھ بھاگ گئے۔ کچھ بھاگنے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ میں اب بے یار و مددگار ہوں۔ آپ کی سرپرستی کا طلب گار ہوں۔

میں نے میر رسول بخش تالپور کو بھی خط لکھا تھا۔ اپنے گناہوں سے توبہ کی تھی۔ آئندہ نیک چلن رہنے اور شریفانہ زندگی گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میر صاحب قانون کے معاملے میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتے۔ لیکن جو کام وہ نہیں کر سکتے وہ آپ کر سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ ضرور کر سکتے ہیں۔ مجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ضرور پکڑا جاؤں گا۔ لیکن اگر میں "ڈان" کا چیف ایڈیٹر بننے کے بعد پکڑا گیا تو کم از کم اتنا تو فائدہ ہوگا کہ جیل کی تنی کلاس کی بجائے الطاف گوہر کی طرح کسی شاندار بنگلے میں نظربند کر دیا جاؤں گا۔ جیل میں رہوں گا تو چکی کی مشقت کرنی ہوگی۔ وارڈن کی ڈانٹ پھٹکار سننی ہوگی۔ بنگلے میں مزے سے گزر بسر ہوگی۔ ریڈیو ملے گا۔ اخبارات ملیں گے۔ اچھا کھانے کو ملے گا۔ اچھا پہننے کو ملے گا۔ پھر اس طرح پکڑے جانے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ میری نظربندی اخبارات کی آزادی کا مسئلہ بن جائے گی۔ جمہوریت کا مسئلہ بن جائے گی۔ نیشنل عوامی پارٹی میری حمایت میں قرارداد منظور کرے گی۔ جماعت اسلامی قرارداد منظور کرے گی۔ مسلم لیگیں قراردادیں منظور کریں گی۔ میری رہائی کے لئے مودودی بیان دیں گے۔ نورانی بیان دیں گے۔ ولی خاں بیان دیں گے۔ اصغر خاں بیان دیں گے۔ پریس کانفرنس کریں گے۔ جلسے کریں گے۔ جلوس نکالے جائیں گے۔ احتجاج ہوگا۔ ہڑتالیں ہوں گے۔ مظاہرے ہوں گے۔ یوم سیاہ منایا جائے گا۔ اخبارات میں اداریے لکھے جائیں گے۔ لمبی چوڑی خبریں چھپیں گی اور تصویر کے ساتھ چھپیں گی۔

میں اس طرح پکڑا گیا تو اسلام پسندوں کی اسلام پسندی جاگ اٹھے گی۔ مودودی اور نورانی کا سیاسی دھندا چلنے لگے گا۔ الیکشن میں جو مارے گئے تھے وہ سیاسی مردے زندہ ہو جائیں گے۔ اصغر خان کا بیان چلے گا۔ آپ کا فتویٰ چلے گا۔ اخباری وڈیروں کا کاروبار چلے گا۔ بلیک میلروں کی بلیک میلنگ چلے گی۔ لیڈروں کی لیڈری چلے گی۔ سیاست کا بازار گرم ہوگا۔ قوم کا بیڑا ہوگا۔ ہوا کرے۔ آپ کا تو حلوہ مانڈہ ہوگا اور اپنا ہر طرف چرچا ہوگا۔ باپ دادا کا نام روشن ہوگا۔

مولانا آپ کہیں گے میں "ڈان" کا چیف ایڈیٹر نہیں بن سکتا۔ کیوں نہیں بن سکتا۔ میں الطاف گوہر سے تیلا موتا ہوں۔ ٹھیک ہے کہ میں ڈاکو ہوں، قاتل ہوں۔ میں نے ڈاکے ڈالے ہیں۔ قتل کئے ہیں۔ بھرے پُرے گھروں کی خوشیاں چھینی ہیں۔ ماؤں کی گود اجاڑی ہے۔ بیویوں کا سہاگ لوٹا ہے۔ خون خرابہ کیا ہے قتل و غارت گری کی ہے۔ مگر الطاف گوہر نے بھی پریس آرڈی ننس لگا کر جمہوریت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ عوام کو گمراہ کیا۔ سومار کو پریس ٹرسٹ کا چیئرمین بنوایا۔ شوکت صدیقی اور ابراہیم جلیس کو انجام کی ایڈیٹری سے نکلوایا۔ ضمیر صدیقی کو ایوب خاں کے بارے میں معمولی سی خبر چھاپنے پر ڈیلی نیوز سے برطرف کروایا۔ الطاف گوہر نے ایوب خاں کے ہاتھ مضبوط کئے۔ اس کی آمریت کا بول بالا کیا۔ سیاسی کارکنوں کو جیلوں میں ڈلوایا۔ عوام کی زبانوں پر پہرے بٹھائے۔ ان پر لاٹھیاں چلوائیں، گولیاں چلوائیں۔ ان کے حقوق چھینے، ان کی آزادی چھینی۔

میں نے تو صرف چند قتل کئے ہیں، چند ڈاکے ڈالے ہیں۔ لیکن الطاف گوہر کے ہاتھوں تو جمہوریت کا قتل ہوا ہے۔ صحافت کا قتل ہوا ہے۔ انسانی ضمیر کا قتل ہوا ہے۔ الطاف گوہر نے سیاست پر ڈاکہ ڈالا۔ ثقافت میں نقب لگائی۔ معیشت پر شب خون مارا۔

کہتے ہیں سانپ کا کاٹا سوتا ہے اور میرا مارا ہوا روتا ہے لیکن الطاف گوہر کا مارا ہوا تو رو بھی نہ سکا۔ فریاد بھی نہ کر سکا۔ اس لئے کہ ان پر ایوب آمریت کا سایہ تھا۔ پولیس تھی۔ سی آئی ڈی تھی۔ اقتدار تھا۔ طاقت تھی۔ قوت تھی۔

جب ترمیم پسند اور اسلام پسند الطاف گوہر کے گناہ معاف کر سکتے ہیں تو میرے گناہ بھی انہیں معاف کرنے پڑیں گے۔ جب وہ الطاف گوہر کو شہید صحافت بنا سکتے ہیں تو مجھے بھی بنانا پڑے گا۔ جب وہ الطاف گوہر کو ہیرو بنا سکتے ہیں تو مجھے بھی بنانا پڑے گا۔ جب وہ الطاف گوہر کے لئے صبح شام دہائی دے سکتے ہیں۔ بیان بازی کر سکتے ہیں۔ احتجاج کر سکتے ہیں۔ دھمکیاں دے سکتے ہیں تو انہیں میرے لئے بھی یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔ ہم دونوں میں فرق ہی کیا ہے۔ صرف تکنیک کا۔ پھر میرا نامۂ اعمال بھی اتنا سیاہ نہیں۔

بات صرف اتنی ہے کہ بد اچھا، بدنام بُرا۔ میں غریب آدمی ہوں اس لئے بدنام ہوں۔ الطاف گوہر بدنام ہو کر بھی "نیک نام" کہلاتے ہیں۔ وہ بدنام ہو کر ملازمت سے نکالے گئے تو پانچ اخباروں کے ایڈیٹر بنے۔ صحافت کے اجارہ دار بنے جمہوریت کے متولی بنے، سیاست کے چودھری بنے۔ اخباری وڈیروں کے راج دلارے بنے۔ اسلام پسندوں کی آنکھ کا تارا بنے اور میرے لئے جیل کی کال کوٹھڑی ہے یا پھانسی کا پھندا ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔

مولانا! یہ کیسا کلجگ ہے۔ لوگ چھوٹے ڈاکوؤں کو تو تختہ دار پر لٹکا دیتے ہیں لیکن بڑے ڈاکوؤں کو بخش دیتے ہیں ان کی پرستش کرتے ہیں۔ ان پر پھول نچھاور کرتے ہیں۔ ان کے لئے آنکھیں بچھاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں!

پیکنگ میں ۴۸ گھنٹے - (۲)

چینی دوست کے کارڈ

فیروزی رنگ کی شنگھائی

اور سبز چائے - یاسمین

قومیں اپنے وسیلوں اور بازوؤں پر بھروسہ کر کے عظیم طاقتیں بنتی ہیں

محمود شام

پیکنگ ایئرپورٹ پر شدید سردی ہے۔ تیز سرد ہوا لپٹے جا رہی ہے۔ ہم نے اپنے جسموں پر جانے کتنے گرم کپڑے لاد لئے ہیں۔ سر اور کان گرم ٹوپیوں میں چھپا لئے ہیں۔ وزیراعظم چو۔ این لائی ننگے سر ہیں البتہ انہوں نے اوورکوٹ پہن رکھا ہے۔ بھٹو صاحب بھی اوورکوٹ میں ہیں۔ عظیم چین کے عظیم عوام کے بعد غیر ملکی سفارتی نمائندے صدر پاکستان کے استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔ اور اس کے بعد پاکستان کے سفارت خانے کے ارکان اور دوسرے شہری پاکستانی رہنماؤں سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ ایک متحرک، فعّال۔ باعمل اور اپنی منزل کے لئے ہر لحہ برسر پیکار قوم کے بیٹے اور بیٹیوں کے اعتماد بھرے چہروں اور عزم سے تمتماتی ہوئی پیشانیوں کے درمیان ایک طرف مجھے کم مائگی کا احساس بھی ہوتا ہے اور دوسری طرف ایک ہمّت بھی بندھتی ہے۔ کہ قومیں صرف اپنے وسیلوں اور بازوؤں پر بھروسہ کر کے ہی دنیا کی عظیم طاقتوں میں شامل ہو سکتی ہیں اور اپنے افراد کو خود اعتمادی اور عزتِ نفس بخش سکتی ہیں۔ دور دور تک پھیلی ہوئی برف اور تیز سرد ہواؤں کے درمیان یہ ایک احساس مجھے حرارت پہنچا رہا تھا۔

صدر پاکستان اور چین کے وزیراعظم۔ چین کی بنی ہوئی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ جس پر چین اور پاکستان کے پرچم لہرا رہے تھے۔ گاڑیاں روانہ ہو رہی تھیں۔ ایک چینی دوست کچھ کارڈ لے کر ہمارے پاس آگئے۔ وزیٹنگ کارڈ کی طرح کے چھوٹے چھوٹے کارڈ۔ ان میں پاکستانی وفد کے ہر رکن کا الگ الگ کارڈ تھا۔ جس پر اس کے لئے مخصوص گاڑی کا نمبر، ہوٹل کا نام اور ہوٹل کا کمرہ تحریر تھا۔ انگریزی اور چینی زبانوں میں یہ سب باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ فیروزی رنگ کی ایک گاڑی جو چین میں ہی تیار ہوئی ہے۔ اور اس کا نام شنگھائی ہے ہمارے لئے مخصوص تھی۔ صحافیوں کو پیکنگ ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ گاڑیوں کے نمبر ونڈ سکرین پر سُرخ رنگ میں لکھ کر چسپاں کئے گئے تھے۔ دو دو مہمانوں کو ایک گاڑی دی گئی تھی۔ تمام لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ چکے تو قافلہ روانہ ہوا۔ ایئرپورٹ کی حدود سے باہر نکلے، تو ہم دورویہ سڑک کے دائیں طرف چل رہے تھے۔ چین میں ٹریفک دائیں طرف چلتا ہے۔ اس معاملے میں چین (RiGHTiST) ہے اور امریکہ کے ساتھ ہے۔ سڑک کے دونوں طرف اور درمیان میں لانبے لانبے درخت کھڑے تھے اور سڑک کے علاوہ ہر طرف برف اور فقط برف تھی۔ کھیت، مکان، درخت سب کچھ برف میں ڈھکا ہوا تھا۔ سفید چادر تھی کہ دور تک بچھی ہوئی تھی۔ درخت خزاں زدہ تھے۔ اپنی شاخوں پر پتوں کی بجائے، وہ برف کے ذرّوں کو اٹھائے کھڑے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چین کی عوامی فوج کے گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے نظر آتے تھے۔ برف کی وجہ سے آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کہیں کہیں بعض ساتھ والے چھوٹے راستوں پر سائیکل چلتے دکھائی دیتے تھے۔ رستے میں شیشے کے بنے ہوئے ٹریفک بوتھ تھے جہاں سے ٹریفک کا سپاہی ٹریفک کنٹرول کرتا ہے۔ گرم ٹوپی پورے بازو کی سبز واسکٹ، نیلی برجیس نما پینٹ اور بازو پر سفید پٹی پر سُرخ رنگ میں کچھ چینی زبان میں لکھا ہوا۔ یہ ٹریفک کے سپاہی کی پہچان ہے۔ چین میں مقیم ہمارے دوست احفاظ الرحمان نے بتایا کہ چین میں اِس کے علاوہ پولیس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ راستے میں کئی جگہ سڑک کے ایک طرف بجلی سے چلنے والی بسوں کو انتظار کرتے دیکھا۔ سڑک بہت چوڑی تھی اور درخت بھی بڑے خوبصورت انداز میں اور بڑی تعداد میں لگے تھے۔ میں اِس برفیلے ماحول کے سحر میں اس قدر کھو گیا تھا۔ کہ میں اپنے ہم سفر۔ نیوٹائمز کے میر جمیل الرحمان کی موجودگی سے بھی بے خبر ہو گیا تھا۔ فرصت ملی ان کی طرف دیکھا، وہ بھی اپنے کیمرے کی آنکھ سے چین کے مناظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ پہلے بھی چین آچکے ہیں شہر ایئرپورٹ سے خاصی دور تھا۔ یہی کوئی ۲۵ میل کے قریب ہماری گاڑیوں کا قافلہ بھی بہت طویل تھا۔ شہر میں داخل ہوئے تو سڑک اور وسیع ہو گئی۔ اتنی وسیع کہ یہاں ہم پاکستان میں رہتے ہوئے اِس کی وسعت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے یہ وسعتِ ظرف۔ صرف سڑکوں تک ہی نہیں چینیوں کی ہر عمارت میں موجود ہے، عمارتوں کے بعد ان کے دلوں، ذہنوں اور نظروں میں بھی ہے۔

پہلی بار جو شخص چین آتا ہے، وہ بہت ہی عجیب قسم کے تصوّرات تراش کر آتا ہے۔ لیکن یہاں آکر اُسے اس کے باوجود اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمارے جیسے فلیٹ، درخت، مکانات، سڑکیں گلیاں ——— مگر ان میں بسنے

پیکنگ کی ایک شاہراہ سے "سمّی مری جان، یین واری" کا نغمہ پھوٹ رہا تھا

والے افراد ہم سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں مکانات میں اینٹیں پنجاب جیسی استعمال ہوتی ہیں۔ سڑکیں بہت وسیع، ہیں۔ پھر ان کے بعد عمارتوں تک اور بھی کئی بغلی راستے، ہیں۔ پارک ہیں۔ بڑی بڑی بلڈنگیں شروع ہو گئی تھیں۔ ایک طرف عظیم رہنماؤں سٹالن اور لینن کی تصویریں تھیں۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا چوک تھا۔ جو کچھ جانا پہچانا لگا۔ مجھے یوں لگا کہ میں یہاں پہلے بھی کبھی آیا۔ میں نے میر جمیل الرحمان سے تصدیق چاہی کہ کیا یہ ٹین مین اسکوائر ہے جہاں سے چیئرمین ماؤزے تنگ سلامی لیتے ہیں۔ انہوں نے تصدیق کی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ سامنے فلک بوس ستونوں والی پُرشکوہ عمارت عوام کا عظیم ہال ہے۔ اور اس سے آگے پھر سڑک پر مارکس اور اینگلس کی تصویریں تھیں۔ پھر ایک دم کانوں میں ایک پنجابی گانے کی دھنیں پڑنے لگیں۔ سڑک کے دونوں طرف سے یہ دھنیں ابھر رہی تھیں۔ پیکنگ کی یہ سب سے بڑی شاہراہ "سمّی مری جان۔ یین واری" کی دھنوں سے گونج رہا تھا۔ میر صاحب نے بتایا کہ یہ درختوں اور کھمبوں پر لاؤڈ سپیکر نصب ہیں۔ ان سے یہ دھنیں ابھر رہی ہیں۔ ان پنجابی دھنوں کے دوش پر ہم آگے پہنچے تو دونوں طرف سے پھولوں، گلدستوں، رنگین جھنڈیوں، رنگین رومالوں والے چینی نوجوانوں، بچوں، لڑکیوں نے چین کے رقص پیش کرتی لڑکیوں نے خیر مقدم کرنا شروع کر دیا۔ سڑک کے درمیان سُرخ بینروں پر انگریزی میں۔

"صدر بھٹو کو گرم جوشی سے خوش آمدید۔"

"غیر ملکی جارحیت کے خلاف جدوجہد کرتے پاکستانی عوام کی مضبوط حمایت۔"

"پاکستان کے ممتاز مہمانوں کو گرمجوشی سے خوش آمدید۔"

"افریشیائی عوام کا عظیم اتحاد زندہ باد۔"

"پاک چین دوستی۔ زندہ باد۔"

عظیم قوم کے یہ عظیم بیٹے۔ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ کیا جذبات رکھتے ہوں گے۔ ہر گاڑی میں مہمانوں کی طرف وہ جھک جھک کر دیکھتے اور پھر ہاتھ ہلا ہلا کر خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کے لبوں پر معصوم مسکراہٹیں ہیں۔ چہروں پر پاکیزگی ہے۔ بوڑھے بھی ہیں۔ بچے بھی ہیں۔ بچیاں بھی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، کھلی پیشانیاں، صحت مند چہرے کھلے گلاب۔ یہ اپنے مہمانوں کا استقبال کر رہی ہیں۔ پورے خلوص اور محبت کے ساتھ اس لئے نہیں کہ ہم کوئی عظیم قوم ہیں۔ فتح مند قوم ہیں۔ کامیاب قوم ہیں۔ اس لئے کہ اُن کے رہنما، پاکستان کو اپنا دوست کہتے ہیں۔ یہ اپنے رہنماؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے رہنما۔ جنہوں نے قربانیوں، مصیبتوں، تکلیفوں اور طویل جدوجہد کے بعد اس قوم کو غیر ملکی غاصبوں، استحصال کرنے والے طبقوں سے نجات دلائی۔ ان رہنماؤں کو ہر بات قابل اعتبار اور قابل تقلید ہے۔ اِن رہنماؤں نے کہا ہے تو وہ اپنے مہمانوں کے استقبال کے لئے آگئے ہیں۔ چینی زبان میں وہ مسلسل کچھ کہہ رہی ہیں۔ گاڑیاں سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں داخل ہو گئی ہیں۔

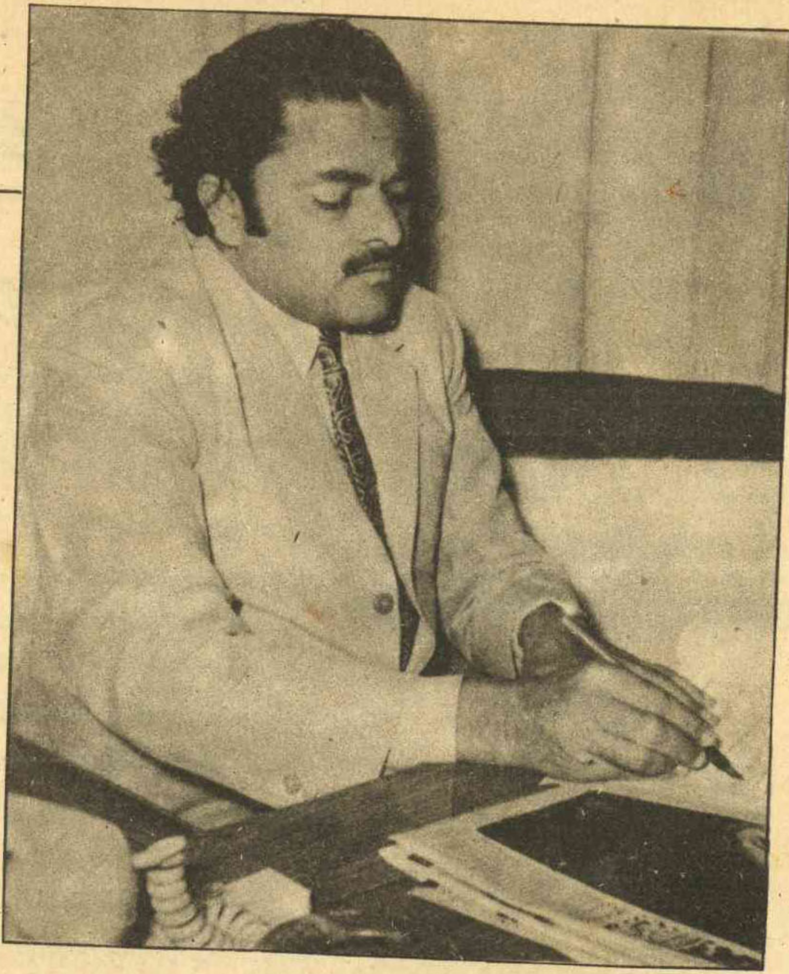
یہ بھی بہت وسیع عمارت ہے۔ روشنیں، سڑکیں، ہال۔ ہم ایک ہال میں پہنچے ہیں۔ اوورکوٹ، ٹوپیاں کھونٹیوں پر لٹکاتے۔ ہم اندر داخل ہو گئے ہیں۔ چین کی کسی عمارت کے اندر میں پہلی بار داخل ہو رہا ہوں۔ ایک ہال میں سرکاری وفد بیٹھ گیا ہے۔ دوسری طرف ہم بیٹھ گئے ہیں۔ چین کی سبز چائے۔ یاسمین کی خوشبو ہمارا استقبال کر رہی ہے تصویریں بن رہی ہیں۔ ہم ایسی شخصیتوں اور ایسی عمارتوں کے درمیان ہیں جو آج کی عالمی تاریخ میں سب سے اہم ہیں۔ یہ عمارتیں دنیا کی تاریخ پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ وزیر اعظم چو۔ این۔ لائی بیسویں صدی کی تین چار تاریخ ساز شخصیتوں میں سے ہیں۔ ملاقاتیں اور مصافحے ہو رہے ہیں۔ صدر پاکستان قدرے آرام کے لئے جا رہے ہیں۔ ہمیں پیکنگ ہوٹل میں پہنچنا ہے۔ اپنی اپنی گاڑیاں تلاش کر کے ہم ان میں بیٹھ کر ہوٹل روانہ ہو گئے ہیں۔ استقبال کرنے والے بچے بچیاں واپس جا رہے ہیں۔ ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کو چھیڑتے۔ پیکنگ ہوٹل بھی وسیع و عریض ہوٹل ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ بڑے بڑے ڈائننگ ہال۔ استقبالئے۔ برآمدے۔ سٹور، سفید کوٹ، نیلی پینٹ میں ملبوس ہوٹل میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں مسکراتے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔ ہوٹل کی لکڑی کی سیڑھیاں، قدیم مشرقی طرز کے محلات کی سیڑھیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ سُرخ قالین بچھے ہوئے ہیں۔ لفٹ بھی ہے۔ جس کے ایک بوتھ میں مرد آپریٹر ہے۔ دوسرے میں خاتون آپریٹر۔ میرا کمرہ نمبر ۴۲۵ ہے مقامی صحافی اس منزل پر ٹھہرے ہیں۔ کمروں کے درمیان میں بڑا کھلا راستہ ہے۔ سُرخ قالین دور تک بچھا ہوا ہے۔ انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل وغیرہ ان کے آگے ہیچ ہیں۔ باہر شدید سردی تھی مگر یہاں حرارت ہے۔ یہاں عمارتوں کو گرم رکھنے کا انداز یورپی ہے۔ گرم پانی کے پائپوں سے گرم رکھا جاتا ہے۔ کمرے بڑے بڑے ہیں۔ قدیم طرز کے۔ اونچی مسہریاں۔ ایک طرف صوفہ سیٹ۔ ایک بڑی الماری۔ ایک طرف سنگھار میز۔ ایک طرف پڑھنے لکھنے کے لئے میز۔ ٹیبل ڈائری۔ ہولڈر۔ دوات۔ ہوٹل کا لیٹر پیڈ اور لفافے پڑے ہیں۔ ٹیلی فون، بیڈ کے ساتھ ایک ایک میں سلیپر بھی رکھے ہیں۔ فرش لکڑی کا ہے۔ جوتوں کے بوجھ سے لکڑی کا

باقی صفحہ ۳۴ پہ ملاحظہ فرمائیں



احفاظ الرحمٰن - محمود شام اور حامد ہاشمی

سلمان لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر ایس ایم حسن سے ایک ملاقات



رہائشی منصوبہ بندی کی بنیادی خامی ۔۔ محنت کش طبقہ کو شہر سے باہر پھینک دیا گیا

جہاں روزگار وہاں مکان ۔ ہاؤسنگ پلاننگ کی بنیاد بنائی جائے

نعیم آروی

سلمان لمٹیڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر ایس ایم حسن نے کہا کہ ”کراچی میں رہائشی مکانوں کا مسئلہ سب سے سنگین ہے ۔ بدقسمتی سے اس کے لیے باقاعدہ ٹاؤن پلاننگ نہیں کی جاتی محنت کش طبقہ کو شہر سے باہر پھینک دیا گیا ۔ انہیں روزگار کے لیے روزانہ شہر اور سائٹ کے علاقہ میں جانا پڑتا ہے ۔ ٹرانسپورٹ کا معقول انتظام نہیں ہے ۔ جن نواحی بستیوں کو آباد ہوئے سالہا سال گزر گئے ۔ ان بستیوں کے رہنے والے ابھی تک بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں ۔ سائنسی دور میں انہیں بجلی، پانی کے لیے ناقابلِ بیان مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں ۔ ہماری ٹاؤن پلاننگ کی بنیادی خامی یہی رہی کہ شہر سے باہر متمول افراد کو آباد کرنے کی بجائے متوسط طبقے اور مزدوروں کو آباد کیا گیا ۔ ہاؤسنگ پلاننگ میں اگر ”جہاں مکان، وہاں روزگار“ کا خیال رکھا جائے تو شاید مزدور طبقہ کو اتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا نہ پڑے ۔

ہاؤسنگ پلاننگ کی دوسری خامی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شہری ترقیات کے جتنے محکمے ہیں مثلاً کے ۔ ڈی ۔ اے پی ۔ ڈبلیو ۔ ڈی ۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ ، کے ۔ ایم ۔ سی ۔ ان کے درمیان مؤثر رابطہ پیدا کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے ۔ نوکر شاہی اس قسم کے فرائض ادا کرنے میں ہمیشہ ناکام رہی ہے ۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ کیماڑی پل بہت دنوں سے خستہ حالت میں ہے ۔ اس کی مرمت پر ڈیڑھ کروڑ روپے خرچ ہوں گے ۔ بہت پہلے منصوبہ تیار کیا گیا لیکن ترقیات کے محکمے اس منصوبے پر متفق نہ ہوئے ۔ ہر محکمہ دوسرے محکمے سے کہتا رہا کہ وہ اتنا روپیہ دے ، فلاں اتنا دے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پل کی مرمت کا کام آج تک نہیں ہو سکا ۔ ترقیات کے محکموں کے درمیان مؤثر رابطہ پیدا کرنا ضروری ہے ۔ اور یہ کام کوئی پبلک نمائندہ ہی بخوبی انجام دے سکتا ہے نوکر شاہی کے بس کی بات نہیں ۔ نوکر شاہی ملک میں بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے ۔ موجودہ حکومت کے راستے میں بھی مشکلات پیدا کر رہی ہے ۔ اس کی از سرِ نو تنظیم ضروری ہے اس کی بنیاد عوام کی خدمت پر رکھی جائے ۔ اگر اسے عوامی بنیاد پر از سرِ نو منظم نہ کیا گیا تو یہ مستقبل میں بھی برائیوں کی جڑ بنی رہے گی ۔

ایس ایم حسن صاحب نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ”میں اس بات کے خلاف ہوں کہ کراچی شہر کو مزید پھیلایا جائے شہر کے اندر ہزاروں افراد کے لیے رہائشی مکانات تعمیر کرنے



• شہری ترقیات کے محکموں کے درمیان کوئی موثر رابطہ نہیں

• کیماڑی پل کی مرمت کا کام کھٹائی میں پڑ گیا

کی گنجائش موجود ہے۔ پانچ چھ ہزار ایکڑ زمین بے کار پڑی ہے اگر ان جگہوں پر ملٹی اسٹوری بلڈنگیں بنا دی جائیں تو لاکھوں افراد کا رہائشی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ٹاؤن پلاننگ والے اس جانب توجہ نہیں دیتے بلکہ وہ شہر سے میلوں دور ایسی بستیوں کی تعمیر کرتے ہیں جہاں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہوتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ آخر کراچی کو کھینچ کھینچ کر کہاں تک لے جائیں گے ایک نہ ایک دن تو اس کی حد مقرر کرنی پڑے گی۔ رہائشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کراچی کو بلندی کی طرف لے جانا ہوگا۔ اس کے لیے شہر اور اس کے قرب و جوار میں ملٹی اسٹوری بلڈنگیں تعمیر کی جائیں۔ ترقی یافتہ سوسائیٹیوں مثلاً نارتھ ناظم آباد، فیڈرل بی ایریا، ہاؤسنگ سوسائیٹی میں بے شمار پلاٹ خالی پڑے ہیں۔ ان تمام پلاٹوں کو کینسل کیا جائے اور ایک جنرل اسکریننگ کی جائے کہ ایک شخص کے پاس کتنے پلاٹ ہیں۔ اگر ایک شخص کے پاس ایک سے زیادہ پلاٹ ہیں تو (خواہ اس کی بیوی یا اس کے بچوں کے نام پر ہی کیوں نہ ہوں) اسے پلاٹ کی قیمت ادا کر کے واپس لیے جائیں۔ اس طرح حکومت کو بے شمار خالی پلاٹ مل جائیں گے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں نے سوسائیٹیوں کے ذریعے فروخت ہونے والے پلاٹوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک ایک شخص کے پاس کئی کئی پلاٹ ہیں۔ وہ اس کا بزنس کرتے ہیں۔ معمولی قیمت پر خریدے ہوئے پلاٹ چند سالوں کے بعد سونے کے بھاؤ فروخت کر دیئے جاتے ہیں یا مکان تعمیر کر کے کرایے پر اٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ایک منافع بخش کاروبار بن گیا۔ رہائشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اس رجحان کا تدارک کرنا ہوگا۔ جنرل اسکریننگ میں عوام کے منتخب نمائندے کی شمولیت ضروری ہے۔

انہوں نے کہا کہ رہائشی مسئلے سے نمٹنے کے لیے مارٹن روڈ، جہانگیر روڈ، ایبی سینیا لائنز، ٹیونیشیا لائنز، محمود آباد اور ایسے ہی دیگر علاقوں میں ملٹی اسٹوری بلڈنگیں بنوائی جائیں۔ ان علاقوں میں رہنے والوں کو بے دخل نہ کیا جائے بلکہ عمارتوں کی تعمیر کے دوران انہیں عارضی کیمپوں میں رکھا جائے۔ اور جب ملٹی اسٹوری تیار ہو جائے تو مقامی آبادی کو گراؤنڈ فلور میں آباد کر دیا جائے۔

مسٹر ایس ایم حسن نے اسکیم نمبر ۳۳ پر نظر ثانی کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس منصوبے سے عام آدمیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ کئی سال تک پانی اور بجلی جیسی بنیادی سہولت فراہم نہیں ہو گی۔ بے شمار لوگوں کے روپے پھنسے ہوئے ہیں، اس کی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ اس اسکیم کی سوسائیٹیوں کے پاس کروڑوں روپے جمع ہیں۔ اس شہر میں ایسی بے شمار ہاؤسنگ سوسائٹیاں ہیں جو ضرورت مندوں سے پلاٹ کے نام پر لاکھوں روپے وصول کر کے غائب ہو جاتی ہیں یا پانچ چھ سال کے بعد اپنے ممبروں کو پلاٹ مہیا کرتی ہیں۔ کراچی میں ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی کوآپریٹو سوسائٹی نے چھ سات سال سے پہلے لوگوں کو



رہائش کا مسئلہ حل کرنے کے لئے شہر کے اندر کثی منزلہ عمارتیں تعمیر کی جائیں

پلاٹ مہیا کر دیا ہو۔ بیسیوں سوسائیٹیز کے دفاتر بند کر دیئے گئے اور ان کے مالکان لاپتہ ہو گئے۔ روپیہ جمع کرانے والے تھک ہار کر اپنا حساب کتاب اللہ کے سپرد کر کے چپ بیٹھ گئے۔ ایسی بوگس اور جعلی سوسائٹیوں سے عوام کو محفوظ رکھنا بھی حکومت کا فرض ہے۔

انہوں نے کہا حکومت سوسائیٹیز اور پرائیویٹ لمیٹڈ کے درمیان امتیاز برتتی ہے۔ جو سہولتیں سوسائٹیوں کو دی جاتی ہیں وہ پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیوں کو نہیں دی جاتیں جبکہ سوسائیٹیوں کا طریقہ کار الجھا ہوتا ہے۔ وہ آسانی سے پیسے بٹور لیتی ہیں۔ حصص فروخت کرتی ہیں، زمین کی قیمتیں وصول کر لیتی ہیں اور سارے پیسے ہضم کر جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ہم زمین کے نام پر عوام سے پیسہ وصول نہیں کرتے۔ پلاٹ ملنے کے بعد ہم اس کے حقدار ہوتے ہیں۔ شیئرز بھی فروخت نہیں کرتے ترقیات کے جتنے کام ہوتے ہیں انہیں ہم اپنے اخراجات پر آسانی سے مکمل کر لیتے ہیں۔ سوسائٹیاں اپنے بیشتر منصوبے کی تکمیل میں محض اس لیے ناکام رہ جاتی ہیں کہ ان کا طریقہ پیچیدہ اور الجھا ہوا ہوتا ہے۔ ان میں مختلف الخیال افراد ہوتے ہیں اور کسی ایک نکتہ پر متفق ہونا ان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے جبکہ پرائیویٹ لمیٹڈ میں ہم خیال لوگ ہوتے ہیں ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں رہتی اور وہ آسانی سے ہاؤسنگ پلاننگ کر لیتے ہیں۔ چونکہ پرائیویٹ لمیٹڈ کے منیجنگ ڈائریکٹر کا ذاتی مفاد شامل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی اسکیموں کو جلد از جلد مکمل کرانے میں دلچسپی لیتا ہے۔

مختار حسن صاحب نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا کہ آئندہ ہاؤسنگ پلاننگ مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں کی جائے۔ تمام پلاٹوں کو دوبارہ الاٹ کیا جائے۔ فلیٹوں کی تعمیر کا منصوبہ کسی ایسے ٹھیکیدار کو نہ دیا جائے جو اپنے بہتر کام کی ضمانت نہ دے سکے۔ ان سے باقاعدہ گرانٹی لی جائے۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی شرائط نرم کی جائیں اور سود کی شرح بھی کم کی جائے تاکہ کم آمدنی والے لوگ اس سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔



جامعہ کراچی کو ۲۰ بیس لاکھ روپے کا خسارہ

ذمہ دار کون؟ رجسٹرار اور خازن یا......

نمائندہ الفتح

جامعہ کراچی کو ۲۰ لاکھ روپے کا خسارہ ہوا۔ اس خسارے کے ذمہ دار جامعہ کے رجسٹرار اور جامعہ کے خازن قرار دیے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ یونی ورسٹی کوڈ کے اعتبار سے یہ دونوں حضرات یونی ورسٹی کے اکاؤنٹس کی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں کی نااہلی سے یہ خسارہ ہوا ہے۔ ان میں سے ایک صاحب یعنی رجسٹرار اکاؤنٹ کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ صرف دستخط کرنا جانتے ہیں۔ دوسرے خازن صاحب ہیں جو بہرحال بی۔ کام تھرڈ ڈویژن ہیں۔ ان کا کنٹرول بھی اکاؤنٹس کے معاملے میں ناکافی ہے۔ ان کی حال ہی میں ترقی ہوئی ہے۔ یہ پہلے جامعہ میں آڈیٹر کے عہدے پر تھے۔ خازن بننے کے لئے جامعہ میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی جو قید تھی۔ وہ بھی ان کے لئے نرم کردی گئی۔ اس سے پہلے خازن کے لئے یونی ورسٹی کی یہ شرط تھی کہ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہو اور رجسٹرار کے لئے یہ شرط تھی کہ وہ کم از کم پی۔ ایچ۔ ڈی ہو تاکہ یونیورسٹی کے تعلیمی اور انتظامی مسائل بخوبی حل کرسکے۔

اب صورت یہ ہے کہ خازن نہ مطلوبہ ڈگری رکھتے ہیں اور نہ جناب رجسٹرار۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کی نااہلی سے جامعہ میں مالی اور انتظامی بدعنوانیاں دن بدن بڑھتی جارہی ہیں۔ یہ حضرات وائس چانسلر صاحب کو غلط مشورے دیتے ہیں۔ خازن صاحب اپنی نااہلی کے باوجود جامعہ کے ٹرانسپورٹ آفیسر کا عہدہ بھی دبائے بیٹھے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ٹرانسپورٹ کا نظام بھی خراب ہو رہا ہے۔ ذیل میں مالی بدعنوانیوں کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ اکاؤنٹس آفس میں کئی بی کام حضرات بل کلرک اور معمولی کلرک کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ جب کہ میٹرک پاس خوشامدی اکاؤنٹنٹ بن گئے ہیں۔

۲۔ بدعنوانیوں کا یہ عالم ہے کہ ایم اے پاس کلرک کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں اور میٹرک پاس اسسٹنٹ کے گریڈ اور عہدے پر فائق ہیں۔

۳۔ انتظامیہ اپنے پسندیدہ لوگوں کو اسکیل کی آخری تنخواہ دے کر باہر سے رکھ لیتی ہے۔ جب کہ کافی سینئر لوگ جامعہ میں موجود ہیں انہیں ترقی نہیں دی جاتی۔

۴۔ جامعہ چھپائی کے کام پر اور آفس اسٹیشنری پر لاکھوں روپیہ صرف کرتی ہے جب کہ جامعہ کو ۲۰ لاکھ روپے کا خسارہ ہے۔ اس غیر ضروری مد میں لاکھوں روپیہ صرف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح سے گورنمنٹ کا روپیہ بے دردی سے برباد کیا جارہا ہے۔ ایک سال میں اس مد میں خرچہ کی تفصیل سے یہ بات سامنے آئے گی کہ جامعہ اس مد میں کس طرح روپیہ برباد کر رہی ہے اور اسٹیشنری سپلائی کرنے والے کتنے سپلائیر ہیں جو انتظامیہ کے منظورِ نظر سپلائیر ہیں۔

۵۔ "پنجاب ہاؤس" کی بار بار شکایت وصول ہونے کے باوجود اس کو خاص طور پہ گون سپلائی کرنے کا ٹھیکہ کون دیتا ہے۔ اور کیوں دیتا ہے۔ ملازمین کی وردیاں سلوانے کے لئے اس کو کیوں آرڈر دیے جاتے ہیں جب کہ اُس کے خلاف بڑے سنگین الزامات ملازمین لگا چکے ہیں۔ آخر پنجاب ہاؤس کی اس طرح رجسٹرار صاحب اور وائس چانسلر کے سیکرٹری کیوں اتنی حمایت کرتے ہیں۔ اس میں کیا راز ہوسکتا ہے؟

۶۔ ٹرانسپورٹ کے انچارج آج کل خازن صاحب ہیں اور وہ اس عہدے کو ہر صورت میں اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟۔ ایک آسٹن گاڑی ان کے لئے ہر روز ڈیوٹی پر ہوتی ہے۔ یہ گاڑی دفتری اوقات کے بعد ہمیشہ خازن صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ کو لے کر شہر جاتی ہے اور لاگ بک میں اس کا مقصد ٹیکنیکل ورک یا سرکاری ڈیوٹی بتائی جاتی ہے۔ یہ ڈیوٹی کس قسم کی ہوتی ہے کہ دنیا کے سارے دفاتر تو بند ہوتے ہیں جامعہ میں ڈیوٹی چلتی ہے۔

یہ خوب صورت گاڑی کسی اور کو نہیں دی جاتی صرف خازن صاحب کے لئے مخصوص ہے جو ٹرانسپورٹ آفیسر بھی ہیں۔ اسٹاف کے دوسرے ممبران اگر گاڑی سرکاری کام کے لئے مانگیں تو خازن صاحب کا موڈ ایک دم خراب ہوجاتا ہے۔ اور غصے میں چلانے لگتے ہیں: "کہاں سے لاؤں گاڑی ہر ایک سرکاری کام کے لئے گاڑی مانگتا ہے"۔ ایک مرتبہ ایک لیکچرار خاتون کو ڈانٹ دیا کہ "نہیں ہے میرے پاس گاڑی جاؤ میں کچھ نہیں کرسکتا"۔ یہ بات نرمی سے بھی کہی جا سکتی تھی۔ مگر اُن کا مزاج شاہانہ ہے۔ جب یہ جامعہ میں صرف آڈیٹر تھے تو بہت خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے تھے اور سب سے مسکرا کر بات کرتے تھے۔ اس آسٹن گاڑی کو صرف دوسرا شخص اگر استعمال کرسکتا ہے تو وہ ہے۔ "نائب خازن"! ان صاحب کا نام ڈپٹی ٹریژرار لوگوں نے اس لئے رکھا ہے کہ یہ خازن صاحب کے خاص مشیر ہیں۔ ان کے مشورے کے بغیر خازن صاحب ایک قدم آگے نہیں بڑھاتے، انہیں کے مشورے پر عمل ہوتا ہے۔ ٹرانسپورٹ کا ہر ڈرائیور اور کنڈکٹر انہیں دن میں کئی کئی بار خاص سلام کرنے کے لئے حاضری دیتا ہے۔

(آسٹن گاڑی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ دفتری اوقات کے بعد یہ شہر روانہ ہوجاتی ہے۔ یعنی چار بجے کے بعد یا پانچ بجے بعد اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس میں اُن کے خاندان کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت گاڑی کی لاگ بک اور اُس ڈرائیور کے اوور ٹائم بل سے مل سکتا ہے۔ پچھلے دنوں تقریباً تیس ہزار روپے کے فاضل پرزے

منظورِ نظر ٹھیکے داروں کو لاکھوں روپے کی ادائیگی چند لمحوں میں کر دی جاتی ہے

خریدے گئے۔ جن کا ایک بڑا حصہ ابھی تک استعمال نہ کیا جا سکا۔ اس لئے کہ یہ سامان غیر متعلقہ اور غیر ضروری تھا، اور کچھ حصہ بے کار خرید لیا گیا تھا۔ اس پیسے کی بربادی کا خازن صاحب کے پاس کوئی جواب نہیں۔ جب کہ یونیورسٹی کو مسلسل پچھلے کئی سالوں سے خسارے میں دکھایا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ جامعہ کی پرانی مائیکرو ویلسیں اور دوسری گاڑیوں کو فروخت کرنے کے لئے کچھ عرصہ پہلے ٹینڈر طلب کئے گئے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ سب کام فرضی تھا اور بہت تھوڑی رقمیں ان گاڑیوں کے لئے لگائی گئی تھیں۔ وائس چانسلر صاحب نے سختی سے منع کر دیا کہ ان چند کوڑیوں میں گاڑیاں فروخت نہ کی جائیں۔ گاڑیاں بچ گئیں مگر ٹرانسپورٹ افسر نے ان گاڑیوں کو بالکل کھلے حصّے میں رکھوا دیا ہے۔ بارش اور دھوپ سے ان کے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نقصان کا کون ذمہ دار ہے۔ گاڑیاں کھلے حصّے میں سال بھر سے کیوں پڑی ہوئی ہیں۔؟

اسٹوڈنٹ اکاؤنٹس سیکشن کے لئے قیمتی لوہے کے کیبنٹ خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ ان کے بغیر بھی کام خوبی سے چل رہا تھا۔ ایسی صورت میں جب یونیورسٹی کو خسارہ ہے۔ اس قیمتی لوہے کے فرنیچر اور کیبنٹ کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ اس کے استعمال سے بھی اسٹاف واقف نہیں۔ سنا ہے کہ یہ اس لئے خریدے گئے تھے کہ اس وقت اس سیکشن میں ایک خاص صاحب کام کر رہے تھے، وہ تھے خازن صاحب کے "ڈپٹی" یہ سامان ایک خاص سپلائیر سے خریدا گیا تھا جو ڈپٹی صاحب کے دوست بھی ہیں۔ اُس کے بعد اُسی خاص سپلائیر کو نوازا گیا اور اُسی قسم کی کئی مشینیں اور کلکولیٹرز ان سے خریدے گئے۔ "رومیوکو" کے پچھلے ڈیڑھ سال میں جتنے بل ادا کئے گئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے ہزار روپے کا مال ایک ہی سپلائیر سے بغیر ٹنڈر طلب کئے خریدا گیا۔ جب کہ ان جدید مشینوں کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی۔ جامعہ کو مالی پریشانی کا واقعی سامنا ہے تو ان غیر ضروری مشینوں کی کیا ضرورت تھی۔ خریدنے کے کچھ عرصے بعد ہی سارے کلکولیٹرز خراب ہونا شروع ہو گئے۔ ان مشینوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر تھی بھی تو ان کو کسی مناسب ملک سے درآمد کیا جاتا اور ان کی مارکیٹ سے خریداری نہ کی جاتی۔ وہ بھی ایک خاص کمپنی سے جس کے تعلقات ڈپٹی صاحب سے ہیں۔ اگر ان مشینوں کو درآمد کیا جاتا تو ان کی لاگت بہت کم آتی۔ فرم "رومیوکو" کے بلوں کی ادائیگی پچھلے دو سالوں میں یہ بات ثابت کر دے گی کہ اس کو کس طرح نوازا گیا اور خریداری کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ پرچیز آفس اس کا کیا جواب دے سکتا ہے کہ مالی خسارے کے باوجود گورنمنٹ کے پیسوں کو اس طرح کیوں برباد کیا جا رہا ہے۔؟

خازن صاحب بعض تجارتی اداروں کو لاکھوں روپے کی ادائیگی چند گھنٹوں میں کرا دیتے ہیں اور وہ بھی وائس چانسلر کی اطلاع کے بغیر جب کہ دوسری کمپنیوں کے بل اس لیے روک دیئے جاتے ہیں کہ یونیورسٹی کے پاس پیسے نہیں ہیں پٹرول کے بل بے حساب ادا ہوتے ہیں اس میں بھی بڑی گڑبڑ بتائی جاتی ہے۔ اس وقت جامعہ کے پاس بارہ بسیں ہیں ان کی آمدنی ان کے خرچہ سے کم کیوں ہوتی ہے اس کی باضابطہ چیکنگ ہونی چاہیئے تاکہ خسارہ کو مزید نہ بڑھنے دیا جائے۔

کچھ دنوں کی بات ہے کہ آرٹس فیکلٹی کے ایک صدر شعبہ کے لیے ایک قیمتی قالین خریدا گیا جس کی قیمت کئی ہزار روپے ہے۔ کیا ہمارا موجودہ غریب ملک اور بیس لاکھ خسارہ والی جامعہ اس خرچ کو برداشت کر سکتی ہے؟ یہ کس کی اجازت سے خریدا گیا۔ اس سے پہلے بھی میجر آفتاب کے دارالترجمہ و تصنیف و تالیف کے شعبہ کے لیے ایک بہت بڑا قالین تقریباً دس ہزار روپے کا خریدا گیا تھا جو انتہائی بے دردی سے استعمال کیا گیا اور اب ناکارہ کہہ کر ایک طرف ڈال دیا گیا۔ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

میجر آفتاب کے پاس یونیورسٹی کی دو گاڑیاں ہیں وہ ان کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ یہ بااثر آدمی ہیں اس لیے ان کو اس ناجائز استعمال سے نہ تو ٹرانسپورٹ آفیسر روک سکتا ہے اور نہ رجسٹرار۔ گورنمنٹ آڈیٹر نے ان گاڑیوں کے بے جا استعمال پر سخت اعتراض کیا ہے مگر کوئی نہیں سُنتا یہ گاڑیاں ہر روز شہر جاتی ہیں اور لاگ بک میں ڈیوٹی یہ لکھی جاتی ہے کہ "بہ کارِ سرکاری" "برائے ہدایت پرنٹر"۔ آڈیٹروں نے پوچھا تھا کہ یہ کام کیا ٹیلی فون سے نہیں ہو سکتا تھا؟ اس کے باوجود میجر صاحب کی گاڑیاں برابر ڈیوٹی پر شہر جاتی ہیں۔ عید کے دن بھی یہ گاڑیاں شہر گئیں اور تمام دن ڈیوٹی پر رہیں۔ حالانکہ اس روز سارے تجارتی اور چھپائی کے کارخانے بند تھے۔

میجر آفتاب اُردو کالج سے نکالے گئے تو جامعہ میں اصلاحات کمیٹیوں میں شرکت کرنے لگے۔ اس کا معاوضہ انہیں ساڑھے سات روپے یومیہ ملتا تھا۔ اس کے بعد اپنی خاص صلاحیت سے دارالترجمہ کے ڈائرکٹر بن گئے۔ اس کے بعد تادیبی شعبہ کے سربراہ بھی ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ تیسرا عہدہ بھی ان کے ہاتھ لگا، وہ تھا صدر شعبہ نیچرل سائنس، اس کے علاوہ اور کئی چھوٹے موٹے کام بھی سابق وائس چانسلر صاحب نے ان کے ذمے لگائے تھے۔ انہوں نے اپنی علیحدہ بلڈنگ بھی بنوالی اور ٹیلی فون اور ڈکٹا فون بھی لگوالیا۔ پھر جامعہ میں ٹرانسپورٹ کی کمی کے باوجود دو گاڑیاں لے لیں۔ اس کا برابر ناجائز استعمال اب تک جاری ہے۔ آڈیٹروں کی بھی کچھ نہ سُنی گئی۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اب انتہائی قیمتی ٹیپ ریکارڈر ہے، سپر فائن کیمرے ہیں۔ کیا نیچرل سائنس پڑھانے کے لیے یہ ٹیپ ریکارڈر اور یہ سپر فائن کیمرے بھی ضروری ہیں یا یہ چیزیں تادیبی کاروائی میں کام آتی ہیں یا ان کا استعمال ترجمہ، تصنیف اور تالیف میں کیا جاتا ہے؟

کیا یہ غیر ضروری اشیاء خریدنے کے لیے جامعہ میں بیس لاکھ کا خسارہ نہیں تھا؟ اگر نہیں تھا تو ایسی فضول خرچی سے ہُوا۔ اس خسارہ کا کون ذمہ دار ہے؟ انکوائری کمیٹی کو چاہیئے کہ وہ اس کی تحقیقات کرے۔ اور خاص طور پر ان گاڑیوں کی لاگ بک چیک کرے۔ خاص طور پر عید کے دن کے لاگ بک مندرجات!

وائس چانسلر کے سیکرٹری صاحب کو جامعہ نے اتنی مراعات دی ہیں کہ پاکستان کے صدر کے سیکرٹری کو بھی اتنی مراعات حاصل نہیں ہوں گی۔ ان کے ماتحت اسٹاف کی ایک پوری فوج ہے۔ ان کے پاس بھی جامعہ کی ایک کار ہے جسے کوئی دوسرا آفیسر استعمال نہیں کر سکتا۔ یہ گاڑی ان کے گھریلو استعمال میں بھی آتی ہے۔ اس حقیقت کو جامعہ کے ٹرانسپورٹ آفیسر بھی جانتے ہیں لیکن میجر آفتاب کی طرح یہ بھی بااثر آدمی ہیں لہٰذا کوئی ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتا۔ اس گاڑی کا ایک خاص ڈرائیور وصی بخش ہے۔ چونکہ یہ سیکرٹری صاحب کے مصاحبین میں شامل ہے اس لیے ان کا مزاج بھی دوسرے ڈرائیوروں سے بہت اونچا ہے۔ یہ سیکرٹری صاحب کی سفارش سے بیک وقت دو دو ڈیوٹی کی تنخواہ لیتا ہے جو تقریباً تین ساڑھے تین سو

روپے بنتی ہے۔ دن کو ڈرائیوری شام کو واچ اینڈ وارڈ دونوں کی تنخواہ الگ الگ۔ اس ڈرائیور سے سب لوگ ڈرتے ہیں۔ اس کو سیکرٹری صاحب کی گاڑی کے علاوہ کوئی دوسری ڈیوٹی نہیں دی جاتی۔ کس کی مجال ہے کہ سیکرٹری صاحب کے ڈرائیور کو کچھ کہہ سکے۔ سیکرٹری صاحب کی گاڑی کا سپیڈومیٹر ہمیشہ خراب رہتا ہے۔ اس لیے کہ لاگ بک اگر چیک کی جائے تو اس کا سراغ نہ ملے کہ گاڑی کہاں کہاں جاتی ہے اور پٹرول کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ جامعہ کے افسروں کو گورنمنٹ افسروں کی طرح کسی پبلک سروس کمیشن کے سامنے جانا نہیں پڑتا۔ رجسٹرار صاحب ایم اے ہیں مگر انگریزی لکھنے سے کتراتے ہیں، انگریزی بولتے وقت گڑبڑا جاتے ہیں۔ کسی فائل پر ان کا لکھا ہوا نوٹ نہیں مل سکتا۔ نچلا سٹاف لکھتا ہے یہ دستخط کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دن بھر بے شمار دستخط کرتے ہیں، جامعہ کے اعلیٰ انتظامی افسر ہیں مگر ان کی وجہ سے ہمیشہ جامعہ کے انتظام کو نقصان ہی پہنچا ہے۔

علیم صاحب کے زمانے میں جو تحقیقاتی کمیشن آیا تھا اس کی رپورٹ میں موصوف کے خلاف سخت ریمارکس تھے۔ اس ریمارکس پر انہیں شعبۂ امتحانات سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ کو لائبریری سے بھی ہٹوا دیا گیا تاکہ کوئی اس کو نہ دیکھ سکے۔ جامعہ میں کوئی بھی بڑا وزیر یا گورنر آئے تو یہ اس کے قریب نہیں جاتے کہ کہیں انگریزی میں بات نہ کرنا پڑے۔ انہوں نے اپنے اسٹینوگرافر کو کبھی ایک لائن کا ڈکٹیشن نہیں دیا اور وہ غریب ڈکٹیشن کا ارمان اپنے دل میں لیے ملازمت سے ریٹائر بھی ہو گیا۔ اس غریب سٹینوگرافر نے ساری ملازمت کے دوران خالی بیٹھ کر تنخواہ وصول کی اور جامعہ پر مالی بوجھ بنا رہا اس کا ذمہ دار کون ہے؟

رجسٹرار صاحب کو مرغیاں پالنے کا بھی شوق ہے۔ ان کے گھر پر جو کہ یونیورسٹی کیمپس میں ہے ایک عالیشان مرغی خانہ ہے۔ اس کے لیے لوہا، سیمنٹ، لکڑی وغیرہ سب کچھ جامعہ نے مہیا کیا۔ بلکہ بڑھئی بھی جامعہ ہی کا تھا۔ ان سب چیزوں کی مالیت دو ڈھائی ہزار روپے ہوتی ہے۔ ان چیزوں میں اسبسٹوس شیٹ اور پائپ بھی خوب فراخدلی سے استعمال ہوا ہے اس لیے کہ وہ سب مال مفت کا تھا اور جامعہ کا تھا۔ یہ بھی جامعہ کی ٹرانسپورٹ استعمال کرتے ہیں اور بمعہ خاندان: لاگ بک میں لکھتے ہیں کہ "VISIT TO LEGAL ADVISOR" "قانونی مشیر سے مشورہ کے لیے"

چھوٹے لیبروں میں زنت کی

پورے دن کی محنت کا معاوضہ — ۷۵ پیسے

احتشام زریب فاروقی

صاحب! کراچی کو اگر روشنیوں کا شہر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ شام ہوتے ہی جھم جھم کرتے نیون سائنز دمک اٹھتے ہیں اور شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر روشنیوں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ ایلفی ہو، جناح روڈ ہو یا ناظم آباد کی چورنگی، سب کی سب جگمگ جگمگ کرنے لگتی ہیں۔ کاروں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور لوگ خوش خوش بازاروں میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ بے فکرے نوجوانوں کی ٹولیاں ہنستی مسکراتی اور خوش گپیاں کرتی ہوئی فٹ پاتھوں پر سے گزرتی رہتی ہیں۔

لیکن ان ہی بازاروں میں پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ایسے لڑکے بھی ہوتے ہیں جو کاروں کے رکنے سے پہلے ہی ان کی طرف لپکتے ہیں اور "بیگم صاحب... بال پن کنگھے"، "چیونگم، ببل گم" کی آوازیں لگاتے ہیں اور کچھ لڑکے خاموشی کے ساتھ جلدی جلدی گاڑی پر جھاڑن پھیرنے لگتے ہیں۔

ایک شام ہم نے صدر میں دیکھا کہ ایک لڑکا جس کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی بہت سا سامان اٹھائے چل رہا تھا۔ آگے آگے بیگم صاحبہ تھیں اور ان کے پیچھے لڑکا۔ پھر وہ صاحبہ ایک اچھی سی ڈاٹسن کار کے پاس آ کر رک گئیں اور اس لڑکے نے ان کا سامان گاڑی میں رکھ دیا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ بیگم صاحبہ نے گاڑی پر بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ پر کچھ پیسے رکھے اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ وہ لڑکا ایک دم کہنے لگا "دو آنے اور دے دو" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کو کہا اور گاڑی چل دی۔

ہم نے قریب جا کر اس لڑکے سے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا نام ستار ہے۔ ہم نے معلوم کیا کہ اسے کتنے پیسے ملے تھے تو اس نے بتایا کہ بیگم صاحبہ نے صرف دو آنے دیئے تھے۔ جبکہ وہ کافی دور سے ان کا خریدا ہوا سامان اٹھا کر لایا تھا۔ ستار لوگوں کی کاریں صاف کرتا ہے اور کبھی کبھی کسی صاحب یا بیگم صاحبہ کا سامان بھی ان کی گاڑی تک پہنچا کر دو چار آنے کی امید کرتا ہے۔

ستار کا باپ کسی دفتر میں ملازم تھا۔ وہ روزانہ گولی مار سے ٹاور جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس کی طبیعت خراب تھی مگر وہ نوکری پر جا رہا تھا۔ بڑی سڑک پر آتے ہی وہ ایک تیز رفتار گاڑی کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا تھا۔ ویسے یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ اس شہر میں آئے دن یہی کچھ ہوتا ہے۔ ہم نے ستار سے اس کے باپ کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ ہاں... اس نے یہ بتایا کہ اس کی اماں اور ابا کے درمیان اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اور اس کی ماں اپنے بچوں کو کوسنے لگتی تھی۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ پیسوں پر ہی جھگڑا ہوتا ہوگا اور سارے ہی غریب گھروں میں یہی ہوتا ہے۔

ستار اپنے باپ کی موت سے پہلے کھیلا کرتا تھا لیکن اس کے بعد اس کی ماں نے اس سے پیسے کمانے کو کہا اور امی نے صدر میں کلاریں

اس نے صدر کی سڑکوں پر کاریں صاف کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ستار کی ماں ناظم آباد کے دو ایک گھروں میں ملازمت کرتی ہے۔

ستار کے دو چھوٹے بھائی ہیں اور ایک بہن یعنی خاندان میں چار بچے ہیں اور ایک ماں کل پانچ افراد ہیں اس کی ماں زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتی اور وہ یوں کہ اسے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنا ہوتی ہے۔ اس کی کل آمدنی پچیس تیس روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ ستار کو کبھی دن میں روپیہ سوا روپیہ مل جاتا ہے اور کبھی اس سے کم۔ اس میں سے دو تین آنے وہ کچھ کھانے میں خرچ کر دیتا ہے اپنی ماں کو وہ ایک روپیہ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔

ہم نے اس سے کہا کہ وہ اتنی دور آتا ہے کسی بنگلے میں دن رات کی نوکری کر لے تو اچھا ہے مگر اس پر اس نے کہا کہ چوری کے ڈر سے لوگ انجان لوگوں کو نوکر نہیں رکھتے۔ ویسے ایسا ہوتا بھی ہے۔ اکثر ملازم خود چوری کرتے ہیں یا کرواتے ہیں لیکن جس معاشرے میں بھوک اور افلاس زیادہ ہو گی اس میں مجرمانہ ذہنیت ہی پروان چڑھے گی۔ ہمارے معاشرے میں ایسے افراد بڑی تعداد میں موجود ہیں جو بے حد غریب ہیں۔ جھونپڑیوں اور گلیوں میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو روٹی کی خاطر نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑ رہا ہے؟

بقیہ: فیض احمد فیض کا انٹرویو

کیسے جائیں۔ کراچی میں ایک بڑے مرکز کے علاوہ لانڈھی، کورنگی، ناظم آباد، سوسائٹی کے اپنے ثقافتی مراکز ہونے چاہئیں۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ پرانے شہروں میں تو ایک نہ ایک مرکزی جگہ ہوتی ہے۔ لیکن نئے شہروں میں مراکز نہیں ہیں۔ کراچی بغیر کسی منصوبہ بندی کے پھیل گیا ہے اس لیے اس کا کوئی سنٹر نہیں ہے۔ حالانکہ لندن اور ماسکو میں بھی مرکز موجود ہیں۔ ہر شہر کے بڑے مرکز میں دوسرے علاقائی مراکز سے فنکار آ کر اپنا فن پیش کریں۔ اور ان بڑے مرکزوں سے فنکار چھوٹے مراکز میں فن پیش کریں۔

میں نے دریافت کیا کہ اس سلسلے میں تو بڑے اخراجات کی ضرورت ہو گی موجودہ حالات میں یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

فیض صاحب نے جواب دیا کہ ہمارے ہاں یہ بھی بڑا غلط تصوّر رہا ہے کہ پہلے محل کھڑا کیا جائے پھر کام شروع ہو۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ہر شہر میں پہلے سے ایسے مراکز موجود ہیں۔ ان کے استعمال کی بات ہے۔ کراچی میں فریئر ہال ہے۔ لاہور میں منٹگمری ہال ہے۔ تاریخی عمارتیں ہر ملک میں ثقافتی مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا کیوں نہ ہو۔ لاہور میں شاہی قلعہ، مقبرہ جہانگیر ہے۔ ہر علاقے میں ایسی ایک آدھ عمارت مل سکتی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ہر ریلوے جنکشن میں ریلوے ہال موجود ہے جو عام طور پر ریلوے کے مزدوروں کو فلم وغیرہ دکھانے کے لیے بنائے گئے تھے۔ مگر آجکل یہ ہال بے کار پڑے ہیں ان کو بآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور یہاں تمام فنونِ لطیفہ کے متعلق نمائشیں منعقد کی جا سکتی ہیں۔

ہر علاقے کی میونسپل کمیٹی یا کارپوریشن پر یہ ذمہ داری ڈالی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بجٹ میں اس کی گنجائش پیدا کریں۔ صوبائی سطح پر صوبائی حکومتوں سے کافی مدد لی جا سکتی ہے۔

فلم کے سلسلے میں فیض صاحب نے کہا کہ ہمارے فلمسازوں نے تجارتی مقاصد کے پیشِ نظر فلم کے وسیلۂ اظہار کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس ادارے کی طرف سے کوشش کی جائے کہ قومی ثقافتی موضوعات پر یہ ادارہ خود فلمیں بنائے تاکہ فلمسازوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو۔

نیشنل کونسل آف کلچر کے سلسلے میں خاص تفصیل سے بات ہو چکی تھی اس لیے میں نے فیض صاحب سے اجازت چاہی —— اور باقی باتیں پھر کسی نشست پر اٹھا رکھیں۔

الفتح

مارشل لاء شیر کی سواری ہے آپ اس پر سواری نہ کریں : صفحہ ۶ سے آگے

نہیں آج کے سارے اخبارات پڑھے ہیں۔ میں روز ہی سارے اخبارات پڑھتا ہوں۔ یہاں تک کہ باہر کے بھی جتنے اخبارات مل سکتے ہیں انہیں بھی پڑھتا ہوں۔ مگر جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ اب تک پاکستان کے کسی اخبار میں نہیں چھپی مہربانی فرما کر یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

ایک بار پھر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ "خاموش ہو جاؤ"۔ "خاموش ہو جاؤ"۔ "بیٹھ جاؤ"۔ "بیٹھ جاؤ"۔ آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ مگر قدرت اللہ شہاب نہ بیٹھے۔ شور جب ٹھہر جاتا وہ پھر بولنا شروع کر دیتے۔ اس طرح ان کو کھڑے بیس منٹ ہو گئے۔ فوجی افسروں کے چہرے غصے اور جھنجھلاہٹ سے تمتما رہے تھے اور سول افسروں کے چہرے فق تھے۔ وہ سخت پریشان اور بدحواس تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح قدرت اللہ شہاب کو روکیں۔ کس طرح انہیں باز رکھیں۔ شاید یحییٰ خاں نے ان کی اس پریشانی کو بھانپ لیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"آیئے اب چائے پی جائے۔ بہت ہو چکی باتیں۔"

یحییٰ خاں کے اٹھتے ہی سب کھڑے ہو گئے اور چائے پینے کے لئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ قدرت اللہ شہاب سب سے الگ تھلگ چپ چاپ کھڑے تھے۔ اچانک یحییٰ خاں ان کے پاس آئے اور مسکرا کر کہا۔ "مسٹر شہاب! ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور بہت عرصے سے جانتے ہیں۔"

یحییٰ خاں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔ ان کی پہلی ملاقات اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی۔ قدرت اللہ شہاب ان دنوں حکومت آزاد کشمیر میں سیکرٹری جنرل تھے۔ کشمیر کے مختلف محاذوں پر زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ بھارت کی پوزیشن کمزور تھی۔ پاکستانی ہر محاذ پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ پیش قدمی کر رہے تھے۔ اچانک ایک روز ٹیلی فون پر میجر جنرل شیر خاں کا انہیں یہ پیغام ملا کہ دو پاکستانی فوجی افسر کئی روز سے لاپتہ ہیں۔ ان سے یہ کہا گیا تھا کہ یہ سراغ لگایا جائے کہ یہ دونوں افسر زندہ ہیں یا شہید ہو گئے۔ اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟ دشمن کی قید میں تو نہیں ہیں؟ یہ دونوں افسر یحییٰ خاں اور اعظم خاں تھے۔ یحییٰ خاں اس وقت میجر اور اعظم خاں لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ دونوں بعد میں پاکستان کی اہم سیاسی شخصیتیں بن کر ابھرے، اور یہ میجر جنرل شیر خاں وہی تھے جو بعد میں جھمپیر کے فضائی حادثے میں شہید ہوئے۔

قدرت اللہ شہاب نے میجر جنرل شیر خاں کی ہدایت پر تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں فوجی افسر اچانک اپنے مورچے چھوڑ کر محاذ سے بھاگ گئے۔ اور اس طرح بھاگے کہ اپنے جوانوں کو بھی اعتماد میں نہ لیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ کی۔ دشمن نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ تمام مورچوں پر بغیر کسی دشواری کے قبضہ کر لیا۔ تمام اسلحہ اور رسد کو مال غنیمت سمجھا اور جوانوں کو قیدی بنا لیا۔

مگر تمام چھان بین اور دوڑ دھوپ کے باوجود یحییٰ خاں اور اعظم خاں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ قدرت اللہ شہاب کو تشویش ہوئی۔ حکومت آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم تھے۔ قدرت اللہ شہاب نے ان افسروں کے بارے میں ان سے بھی ذکر کیا۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے کہ ایک علاقے سے یہ اطلاع ملی ہے کہ ایک مکان میں کوئی فوجی افسر موجود ہے۔ لوگوں نے اس کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ صورت حال

یحییٰ خان بہت کھا چکے

اب جی او سی ہو کر

مشرقی پاکستان چلے جاؤ

(ایوب خان)

خاصی تشویش ناک ہے۔ لوگ اس افسر سے کسی بات پر سخت ناراض معلوم ہوتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب فوراً اس جگہ پہنچے۔ دیکھا کہ واقعی لوگ ایک مکان کے گرد اکٹھا ہیں۔ در و دیوار پر پتھراؤ کرتے ہیں اور چیخ چیخ کر کسی کو باہر بلاتے ہیں۔ وہ سخت برہم معلوم ہوتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب بڑی مشکل سے کسی نہ کسی طرح اندر پہنچے۔ دیکھا ایک کمرے میں یحییٰ خاں بیٹھے ہیں۔ میز پر وہسکی کی بوتلیں اور گلاس رکھے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کئی روز سے اس مکان کے اندر موجود ہیں۔ محاذ سے فرار ہونے کے بعد یہاں روپوش ہو گئے۔ لوگوں کی ناراضگی کا سبب یہ تھا کہ شب قدر کو انہوں نے نہ صرف یہ ستم ڈھایا کہ وہسکی سے شوق فرمایا بلکہ کسی کشمیری کو بلا کر عورت لانے کی بھی فرمائش کی۔ اس علاقے کے لوگ کٹر مذہبی لوگ ہیں۔ یحییٰ خاں کی اس حرکت پر بپھر گئے۔ وہ انہیں سزا دینا چاہتے تھے۔ منہ کالا کر کے جلوس نکالنا چاہتے تھے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔

قدرت اللہ شہاب نے لوگوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اُدھر یحییٰ خاں کی حالت خراب تھی۔ مسلسل شراب پینے اور شب بیداری سے اُن کے ہوش و حواس درست نہ تھے۔ کہتے کچھ تھے۔ زبان سے نکلتا کچھ تھا۔ غرضیکہ قدرت اللہ شہاب نے رات کی تاریکی میں کسی نہ کسی طرح ان کو محاصرے سے باہر نکالا۔ آزاد کشمیر میں اُن کے لئے ٹھہرنا سخت خطرناک تھا لہٰذا انہیں راتوں رات پنڈی پہنچایا گیا۔

اِس واقعے کے بعد بھی قدرت اللہ شہاب کی یحییٰ خاں سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ مگر وہ قابل ذکر نہ تھیں۔ اہم ملاقات وہ تھی جب ایوب خان صدر مملکت تھے۔ قدرت اللہ شہاب ان کے پرنسپل سیکرٹری تھے اور یحییٰ خاں سنٹرل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین تھے۔ ایک روز ایوب خاں نے قدرت اللہ شہاب کو بلایا اور ان سے کہا کہ یحییٰ خاں کے بارے میں برابر شکایتیں آ رہی ہیں کہ وہ بُری طرح رشوت کھا رہے ہیں۔ کھلم کھلا خرد بُرد کر رہے ہیں۔ ایوب خاں نے قدرت اللہ شہاب کے ذریعے یحییٰ خاں کو یہ پیغام بھجوایا کہ "اب بہت کھا چکے۔ جی او سی ہو کر مشرقی پاکستان چلے جاؤ۔"

قدرت اللہ شہاب نے یحییٰ خاں کو ایوب خاں کا پیغام دیا تو وہ ناراض ہو کر بولے۔ "اس سے (ایوب خاں) یہ تو پوچھو خود کتنا کھا رہا ہے۔"

قدرت اللہ شہاب نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم اس کھانے پینے سے اُن کا مقصد کیا ہے۔ مجھے تو جو پیغام دیا گیا وہ میں نے پہنچا دیا۔"

یحییٰ خاں نے ہنس کر پوچھا۔ "بڈھا چاہتا کیا ہے؟"

قدرت اللہ شہاب نے جواب دیا۔ "وہ چاہتے ہیں کہ آپ مشرقی پاکستان کے جی او سی ہو کر چلے جائیں۔"

یحییٰ خاں نے کہا۔ "کہہ دینا ایسا ہی ہوگا۔ میں مشرقی پاکستان جانے کو تیار ہوں۔"

اس کے بعد ۳ اپریل ۱۹۶۹ء کو یحییٰ خاں سے قدرت اللہ شہاب کی وہ اہم ملاقات ہوئی جس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ (باقی آئندہ)

[illegible]

ٹوبہ ٹیک سنگھ

وہ پہلے بھی بے دخل تھے اور اب بھی اسی آگ میں جھلس رہے ہیں

طارق سعید

ایوب حکومت نے گھوڑی پال سکیم کے تحت اپنے خاص خاص ٹاؤٹوں کو فارم عطا کیے تھے۔ اس سکیم کو سٹڈ فارم سکیم بھی کہا جاتا ہے جس کے تحت فارم کے مالک کو حکومت کے لیے کچھ خچر پال کر دینے ہوتے تھے جو نہ جانے حکومت کے کس کام آتے تھے۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک سابق کیپٹن گاہی خان کو ایوب خان کے ساتھ خاص تعلقات کی وجہ سے اسی سکیم کے تحت بیس مربع اراضی الاٹ کر دی گئی۔ یہ فارم ٹوبہ ٹیک سنگھ سے پانچ میل جنوب کی طرف کمالیہ روڈ پر واقع ہے۔ ۱۹۵۹ء سے پہلے اس زمین کو مزارعین بٹائی پر کاشت کرتے تھے۔ گاہی خان اپنے ان مزارعین سے ہر قسم کی بے گار لیتا اور اگر کوئی مزارعہ بے گار دینے سے انکار کرتا تو وہ اپنے تنخواہ دار غنڈوں سے اس مزارعہ کو پٹوا دیتا۔

۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں عظیم الشان کسان کانفرنس ہوئی جس میں پاکستان بھر سے مزدوروں اور کسانوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں گاہی خان کے فارم کے مزارعین بھی شامل ہوئے۔ اس کانفرنس میں پاکستان بھر کے کسانوں اور مزدوروں نے اپنے مطالبات منظم طریقے سے منوانے کا عہد کیا۔ ان کے اس جوش و خروش کو دیکھ کر گاہی خان کے مزارعین کے حوصلے بھی بلند ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنے مطالبات منوانے کا عہد کر لیا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۰ء کو ان مزارعین نے گاہی خان کو کسی قسم کی بے گار دینے سے انکار کر دیا۔ جس پر گاہی خان نے اپنے غنڈوں سے ان غریب مزارعین کو پٹوایا اور آٹھ خاندانوں کو زبردستی اپنی زمینوں سے بے دخل کر دیا۔ اس واقعہ کی اطلاع کسان کمیٹی ٹوبہ ٹیک سنگھ کو ملی تو انہوں نے ان مزارعین کے حق میں بہت سے جلسے کیے اور جلوس نکالے مگر نہ تو انتظامیہ نے کوئی کارروائی کی اور نہ ہی گاہی خان پر کوئی اثر ہوا۔ آخر ایک روز ۱۹ اپریل کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے عظیم انقلابی عوام سڑکوں پر نکل آئے اور پورے شہر میں ایک جلوس کی صورت میں مارچ کیا۔ اس جلوس کی قیادت قاضی غیاث الدین جانباز پبلسٹی سیکرٹری نیپ (بھاشانی گروپ)، پنجاب، چوہدری فتح محمد صدر پنجاب کسان کمیٹی اور محمد بخش شہباز بے دخل مزارعین کے رہنما نے کی۔ جلوس میں شامل لوگ ایک چارپائی اٹھائے ہوئے تھے جس پر ایک کتا اٹھایا ہوا تھا اور عوام "گاہی خان کتا ۔۔۔ ہائے ہائے" کے نعرے لگا رہے تھے لیکن اس جلوس کا بھی انتظامیہ یا گاہی خان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ ۱۵ مئی ۱۹۷۰ء کو جلوس کی قیادت کرنے والے تینوں رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور چوہدری فتح محمد، غیاث الدین جانباز کو ایک ایک سال اور محمد بخش شہباز کو چھ ماہ قید کا حکم سنا دیا گیا۔

بے دخل مزارعین اسی امید پر خاموش ہو کر بیٹھ گئے کہ نمائندہ حکومت قائم ہو گی تو انہیں بحال کر دیا جائے گا۔ یہ مزارعین موجودہ گورنر پنجاب سے حکومت بننے سے پیشتر جھنگ میں ملاقات کر چکے ہیں جس میں کھر صاحب نے انہیں یقین دلایا تھا کہ ان کی حکومت آتے ہی انہیں بحال کرا دیا جائے گا۔ اب پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہو چکی ہے لیکن تاحال ان مزارعین کو بحال نہیں کیا گیا۔ یہ لوگ چوہدری محمد اسلم ایم این اے کی وساطت سے گورنر پنجاب کو درخواست دے چکے ہیں۔ گورنر پنجاب نے اس درخواست کو چیف سیکرٹری کے پاس بھیج دیا اور چیف سیکرٹری نے ڈی سی لائل پور کے پاس اور ڈی سی نے اے سی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پاس بھیج دی تاکہ انکوائری کی جائے۔ جس پر اے سی نے پرانی انکوائری کے ساتھ درخواست دوبارہ اوپر بھیج دی ہے، جس کے مطابق مزارعین قانونی طور پر بے دخل کیے گئے تھے۔

لائلپور

اُن کے خلاف انتقامی کارروائیاں تیز کر دی گئیں

جاذب سہیل

لائل پور کے اڑھائی لاکھ مزدوروں میں سخت بے چینی پھیل گئی ہے۔ ٹیکسٹائل، شوگر، سلک ملز، پاور لومز، کیلنڈرنگ پرنٹنگ، ہوزری اور دیگر صنعتی اداروں سے ہزاروں مزدور نکال دیئے گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق کارخانہ داروں نے اڑھائی ہزار مزدور برطرف اور ہزاروں مزدوروں کو قانونی اور جائز مراعات سے یکسر محروم کر کے شدید ترین بحرانی کیفیت

سے دوچار کردیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار فروری کو منعقدہ ایک پریس کانفرنس میں پیشنل پروگریسو ورکرز فیڈریشن لائلپور کے صدر جناب صالح محمد نیازی نے کیا۔ متذکرہ فیڈریشن میں لائلپور کی ۴۳ ٹریڈ یونینیں شامل ہیں۔

صالح محمد نیازی نے بتایا کہ موجودہ حکومت کے واضح اعلانات کے باوجود لائل پور کے صنعتی اداروں کے مالکان نے برطرف شدہ مزدوروں کو بحال نہیں کیا بلکہ انتقامی کاروائیاں تیز تر کردی ہیں۔ جس سے صنعتی امن خطرہ میں پڑگیا ہے۔ لائلپور کی تمام بڑی بڑی ملوں، فیکٹریوں، کارخانوں، فونڈریوں، پرنٹنگ، کلنڈرنگ اور ہوزری کے مالکان نے ورکروں کے ساتھ کوئی باعزت سمجھوتہ کرنے کے بجائے ان کی پریشانی میں اضافہ کردیا ہے۔ اگر مزدوروں کے جائز مطالبات جلد تسلیم نہ کیے گئے تو تمام صنعتی اداروں کے برطرف شدہ اڑھائی ہزار ملازمین بھوک۔ ہڑتال کریں گے۔

جناب صالح محمد نیازی نے غیر مبہم الفاظ میں کہا کہ ہم اپنے مسائل کا پرامن حل چاہتے ہیں مگر سرمایہ دار اور کارخانے دار حکومت کے احکامات کو حقارت سے نظرانداز کرتے ہوئے مزدوروں پر عرصۂ حیات تنگ کررہے ہیں۔

انہوں نے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کیے۔

(۱) ٹریڈ یونین تحریک میں حصہ لینے کی بناء پر غیر آئینی طریقہ سے نکالے گئے ورکرز یا جن سے زبردستی استعفٰے لیے گئے ہیں۔ ان سب کو ملازمت پر باتنخواہ بحال کیا جائے۔

(۲) جن فیکٹریوں میں تالہ بندی کی گئی ہے، مالکان مشینیں اکھاڑ کرلے گئے ہیں یا فیکٹری کے اندر کئی دیواریں بنا کر فیکٹری کے کئی حصے کر دیئے گئے ہیں، تمام دیواریں گرائی جائیں، تالہ بندی ختم کی جائے اور مشینیں واپس منگوا کر فیکٹری میں لگائی جائیں۔

(۳) جن صنعتی اداروں میں شفٹیں کم کی گئی ہیں اور پاورلوم ورکروں سے جو بارہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے، آٹھ گھنٹے کام لیا جائے، ان صنعتی اداروں میں تمام شفٹیں چالو کی جائیں اور برطرف شدہ ملازمین کو ملازمت پر بحال کیا جائے۔

(۴) بجلی کا معقول انتظام کیا جائے۔ اور بجلی فیل ہونے کی صورت میں تمام ملازمین کو اس عرصہ کی نصف اجرت دی جائے۔

(۵) تمام ملوں اور فیکٹریوں کے ملازمین کو دس فیصد رہائشی کرایہ دیا جائے اور مزدوروں کی کم سے کم اجرت ۱۲۵/ روپے ماہانہ مقرر کی جائے۔

(۶) سوشل سیکورٹی میں ترامیم کرکے علاج اور معاوضہ کا معقول انتظام کیا جائے۔ نیز ورکروں سے کٹوتی بند کی جائے۔ بصورت دیگر سوشل سیکورٹی سکیم ختم کردی جائے۔

(۷) تمام صنعتی اداروں کے ملازمین کو سالانہ اتفاقیہ، میڈیکل اور تہواروں کی چھٹیاں، باتنخواہ دی جائیں۔ نیز غیر حاضریوں کی وجہ سے چھٹیاں ختم نہ کی جائیں۔

(۸) تمام ٹیکسٹائل ملوں میں بدلی سسٹم ختم کردیا جائے اور تین ماہ کی ملازمت پر ورکر کو مستقل کیا جائے۔

(۹) ملازمین کو اڑھائی فیصدی اضافی فنڈ دیا جائے۔

(۱۰) تمام صنعتی اداروں کے ملازمین کو تہواری چھٹیوں کے دن اگر ورکر کی ہفتہ وار چھٹی ہو تو اس کی الگ تنخواہ دی جائے۔ نیز تہواری چھٹی کے آگے یا پیچھے تہواری چھٹی ختم نہ کی جائے۔

(۱۱) تمام ملوں اور فیکٹریوں میں پراویڈنٹ فنڈ سکیم شروع کی جائے اور پانچ سال کی ملازمت پر ہر ملازم کو سال میں ایک ماہ کی تنخواہ بطور گریجویٹی دی جائے خواہ وہ ملازمت خود چھوڑ کر چلا جائے۔

(۱۲) تمام ملوں اور فیکٹریوں میں ملازمین کی ورکرز گروپ انشورنس سکیم رائج کی جائے۔

(۱۳) کریسنٹ ٹیکسٹائل ملز کے ملازمین نے ۱۹۷۰ء میں جو ۶۵ دن کی ہڑتال کی تھی، ان دنوں کی تنخواہ دی جائے۔

(۱۴) نیلم فیکٹری اور دیگر ایسی فیکٹریوں میں جہاں غیر قانونی لے آف یا تالہ بندی ہوئی ہے، ورکروں کو ان دنوں کی تنخواہ دی جائے اور تالہ بندی لے آف ختم کرکے ورکروں کو کام پر لگایا جائے۔

(۱۵) گوجرہ کاٹن ملز میں ورکروں سے جو غیر قانونی سیکورٹی جمع کرائی گئی ہیں وہ واپس کی جائیں۔

(۱۶) لائلپور کے تمام صنعتی اداروں میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی لی جائے اور شاپ اینڈ کمرشل آرڈی نینس ۱۹۶۸ء پر مکمل عمل درآمد کیا جائے۔

(۱۷) فیکٹریوں میں پینے کے لیے میٹھے پانی کا بہتر انتظام کیا جائے اور گندے پانی کے نکاس کا معقول بندوبست کیا جائے۔

پیپلز پارٹی کا داخلی انتشار۔ سب سے خطرناک ہے: صفحہ ۴ سے آگے

جا بیٹھے۔ مایوسی کی بات البتہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی جو اقتدار ملنے سے پہلے بہت مضبوط تھی۔ اور عوام میں اس کی جڑیں تھیں۔ اب وہ کمزور ہوگئی ہے اور عوام سے اس کا رابطہ منتشر ہوچکا ہے۔ عوام دشمن سیاسی جماعتیں، بیوروکریسی اور فوج کے اقتدار پرست عناصر — ظاہری طور پر بھی اور خفیہ طور پر بھی — مکمل مدافعت کی کوشش کررہی ہیں اور اپنا دباؤ ڈال رہی ہیں کہ بھٹو لارڈ کانے کا جاگیر دار ہی رہے اور اپنے سوشلزم کے وعدے کی تکمیل کی طرف نہ جانے پائے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ رجعت پسند جماعتیں یہ الزام لگارہی ہیں کہ بھٹو اپنے وعدے بھول گئے اور وہ سوشلزم نہیں لائیں گے۔ رجعت پرستوں کو بھی سوشلزم کا غم کھانے لگا ہے۔ پیپلز پارٹی داخلی انتشار کا شکار ہے — وہ رہنما — جو عوام سے مسلسل رابطہ رکھنے کی وجہ سے عوام میں مقبول ہوئے وہ حکومتی عہدے لے کر حکومتی حلقوں میں جا پہنچے۔ خانۂ خالی کو ولی خان اور اصغر خان جیسے دیو پُر کرنے کی کوشش کررہے ہیں — بھٹو صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ سفارتی محاذ سے فارغ ہونا چاہتے ہیں، باہر کے دورے کررہے ہیں، کچھ غیر ملکی مہمان آنے والے ہیں اس لیے وہ عوامی رابطہ کی مہم پر ابھی نہیں نکل رہے ہیں۔ باقی لیڈر جو عوامی رابطہ کی مہم چلا سکتے ہیں وہ بھی دارالحکومت کی سرد ہوا میں ہیٹر لگائے ہوئے اقتدار کے دن پورے کررہے ہیں۔ عوام ۲۴ سال سے اقتصادی پریشانیوں میں مبتلا تھے، مبتلا ہیں۔ ان کا سب سے بنیادی اور اہم مسئلہ بنیادی ضرورتوں کی چیزوں کی ہوش ربا گرانی ہے۔ آٹا، چاول، دال، دودھ، گھی، نمک، مرچ اور تیل کی قیمتوں کو مناسب سطح پر لاکر کنٹرول نافذ کردیا جائے۔ عوام کا فوری مسئلہ حل ہو جائے گا۔ نہ وہ تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کریں گے اور نہ وہ فی الحال کچھ اور مطالبہ کریں گے۔

اس کے بعد اس وقت جو بڑے قومی مسائل ہیں اور جن پر ہر ذہن پریشان ہے۔ ان کے بارے میں جلسوں اور جلوسوں کے ذریعے عوامی لیڈران کا جواب فراہم کریں تو عوام مطمئن ہوجائیں گے۔ پھر چاہے کتنے ولی خان، اصغر خان میدان میں آجائیں۔ کتنے جنگ گروپ، ڈان گروپ۔ مخالف جماعتوں کو ہوا دے لیں۔ کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اخبارات سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں سب اخبارات ایک طرف تھے۔ مگران کے تمام امیدوار بُری طرح ہارے۔ اخبارات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت عوام کی ہے۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ اس وقت سے ڈریں، جب عوام آپ سے برگشتہ ہوجائیں۔ ابھی سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب کی اکثریت آپ کے ساتھ

ہے۔ وہ مغربی پاکستان کو ایک رکھنا چاہتی ہے۔ انہیں روس امریکہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بھٹو صاحب! اگر کوئی آپ کا اور لیڈر میدان میں نہیں نکل سکتا تو آپ بیرونی سفارتی محاذ چھوڑ کر ادھر نکل آئیے۔ اندرونی محاذ پر آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہماری اصل طاقت عوام ہیں۔ عوام متحد اور خوشحال ہو جائیں تو ہم اپنے بقاء کی جنگ قیامت تک بھی لڑ سکتے ہیں۔ ہر شخص لڑے گا اور اگر عوام سے رابطہ پیدا نہ کیا گیا۔ عوام کا اتحاد حاصل نہ کیا گیا۔ عوام کی ضرورتیں پوری نہ کی گئیں۔ تو عوام اور وطن کے اندرونی اور بیرونی دشمن ملک کی تقدیر کا فیصلہ کرنے میں تین چار مہینوں سے زیادہ کا عرصہ بھی نہ لگائیں گے۔

بقیہ: امریکہ چین کی دہلیز پر

یا صدر کی، ہم انہیں خوش آمدید کہیں گے۔"

جیسے ہی صدر نکسن کے مجوزہ دورے کا اعلان ہوا سوشل سامراجیوں پر اوس پڑ گئی۔ اُن کی حالت اُس پاگل کتے کی سی ہو گئی ہے۔ جس کی دُم پر زہریلی مکھی بیٹھ جاتی ہے۔ مکھی کاٹتی ہے۔ تو بلبلا کر دُم پر مُنہ مارتا ہے۔ مگر دُم تک رسائی نہیں ہوتی چنانچہ غراتا اور چیختا ہے۔ چنانچہ ۱۸ر فروری کو روسی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان نے صدر نکسن کے دورۂ چین کو سوویٹ یونین کے خلاف گٹھ جوڑ قرار دیتے ہوئے لکھا کہ روس اور روسی بلاک کے بین الاقوامی مفادات کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ سازش کی جا رہی ہے۔ صدر نکسن چین سے قریب ہونے کی کوشش اس لئے کر رہے ہیں کہ انہیں سوویت یونین کے ایٹمی میزائلوں کی ترقی سے سخت تشویش ہے۔

لیکن یہ سوشل سامراجی اتنا بھی نہیں سوچتے کہ چین خروشچیف کے نظریہ "پُرامن بقائے باہمی" "پُرامن معاشی مقابلے" پر گامزن نہیں۔ وہ آج بھی امریکی سامراج کا اتنا ہی مخالف ہے۔ جتنا ۲۰ سال پہلے تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ صدر نکسن نے امریکہ سے روانہ ہوتے وقت ایک بیان میں یہ کہا کہ۔ "امریکہ اور چین میدان جنگ کے دشمن بنے بغیر اختلافات رکھنے والی قوموں جیسے تعلقات قائم رکھ سکتے ہیں اور امریکہ اپنے پرانے دوستوں کے نقصان پر چین سے مذاکرات نہیں کرے گا......" اس پر چینی خبر رساں ادارے نے کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ "امریکہ کی طرف سے چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کا دعوے خود اپنی تردید کرتا ہے۔ امریکہ دو چین کے نظریہ کا حامی ہے۔ اس معاملہ میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ تائیوان چین کا اٹوٹ انگ ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی چینی عوام کو ان کے اس جائز اور قانونی حق سے محروم نہیں کر سکتی۔ چین امریکی سامراج اور جارحیت کے خلاف دنیا بھر کے عوام کی حمایت کرتا رہے گا۔ امریکہ کو ہند چینی، جنوبی کوریا۔ تائیوان اور دیگر ان تمام علاقوں سے واپس جانا ہو گا جہاں اُس نے حملہ کر کے قبضہ کر رکھا ہے۔" اس کے علاوہ بی بی سی ریڈیو نے یہ خبر دی ہے کہ چین میں امریکی سامراج اور جارحیت کے خلاف پروپیگنڈہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ پیکنگ میں امریکی سامراج کے خلاف نعرے، پوسٹر اور بینر اب بھی نظر آتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ چین امریکی سامراج اور جارحیت کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہے گا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ سامراجی اور توسیع پسند عناصر اپنے خاتمے تک نہ تو اپنے ہاتھ سے قصاب کا چھُرا چھوڑیں گے اور نہ کبھی مہاتما بدھ بنیں گے۔

بقیہ: پیکنگ میں ۴۸ گھنٹے

فرش گویا ہو جاتا ہے۔ باتھ روم میں نہانے کے لئے ٹب ہے۔ باتھ روم بھی بہت بڑا ہے۔

وسیع النظری چین کا خاصہ ہے۔ یہ پیکنگ ہوٹل ہے صاف ستھرا۔ گرم۔ یہ اپنی زبان حال سے خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ ٹیبل ڈائری میں میں آج کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ ۳۱ر جنوری۔ پرسوں ہم چلے جائیں گے۔ ہم صبح پاکستان کے وقت کے مطابق چھ بجے چلے تھے۔ اور چین کے وقت کے مطابق ۲ بجے یہاں پہنچے تھے۔ ۳ گھنٹے کا فرق پڑ گیا۔ پونے پانچ بج رہے ہیں۔ پاکستان کے پونے دو۔ دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ پاکستان کے مطابق یہ لنچ کا وقت تھا مگر چین کے مطابق لنچ کا وقت گزر گیا تھا۔ وقت سے آگے نکل جانے کا یہ نقصان ہوا۔ ہمارے چینی انگریزی مترجم دوست مسٹر لو لمبے قد اور عینک والے۔ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگوں کے لئے چائے اور سینڈوچ کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ قیام بہت محدود ہے۔ بازار دیکھ لیں۔ کچھ خریداری کر لیں۔ ہمارے زر مبادلہ کی رقم کوئٹہ کے افتخار یوسف کے پاس ہے۔ ہم سب انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ چند لمحوں بعد امریکی کرنسی کو چینی کرنسی میں تبدیل کرلاتے ہیں۔ ۴۳ ڈالر کے ۵۲ یون ملے ہیں۔ چائے پی کر پھر اپنے گرم کپڑے ٹھونس کی پیکنگ کی سرد ہوا میں نکل آتے ہیں۔ بازار نزدیک ہی ہے گاڑی جلد ہی لے پہنچی ہے۔ یہ فرینڈشپ سٹور ہیں۔ پاکستان کے صحافی حضرات مختلف کاؤنٹروں پر ڈٹ گئے ہیں۔ ایک مترجم ہے وہ کبھی اس کاؤنٹر پر بھاگتا ہے اور کبھی اس طرف میں نے چینی کامریڈوں کو ایک ٹوپی پہنے دیکھا۔ سو وہی ٹوپی خرید لی۔ کہ سردی سے بچنے کا کامیاب ذریعہ ہی تھا۔ فرینڈشپ سٹور خاص طور پر غیر ملکی خریداروں کے لئے ہیں۔ اس لئے ہر چیز پر انگریزی میں بھی قیمت درج ہے۔ دام مقرر ہیں۔ پسند کی چیز خریدیے۔ رسید مل جاتی ہے۔ کاؤنٹر پر قیمت ادا کریں۔ رسید پر مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ رسید دکھا کر اپنی چیز لے لیجئے۔ جو اس عرصے خوب صورت کاغذ میں پیک ہو چکی ہے۔ ایک سے ایک خوب صورت کپڑا، سویٹر، بچوں کے لباس، برتن سبزیاں۔ ہر چیز خریدنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر خوب صورت شے دامن پکڑتی ہے۔ مگر معاملہ غیر ملکی زرمبادلہ کا ہے۔ حکومت پاکستان نے صرف ۴۳ ڈالر دیئے ہیں۔ کیا کیا لیں کیا کیا نہ لیں ساڑھے چھ بجے ہمیں واپس پہنچنا ہے۔ کیونکہ سات بجے بات چیت شروع ہونا ہے۔ تیزی سے جو کچھ خریدا جا سکا۔ خریدنے کے بعد ہم پھر گاڑیوں میں بیٹھے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔

بقیہ: ابراہیم جلیس

کر دے گا تو وہ بھٹو اور صرف بھٹو ہے۔

بھٹو ہی اب امید کی آخری کرن ہے اور بھٹو کے بعد اجالا نہیں اندھیرا ہے۔

اس لئے میں اس وقت تک بھٹو کے عوامی مارشل لاء کا حامی رہوں گا۔ جب تک کہ سرمایہ دار، جاگیردار، زمیندار، سیاسی مولوی، مالکان اخبار اور قلم فروش صحافی مارشل لاء کے خلاف مہم اور تحریک چلاتے رہیں گے۔

جس دن بھٹو اس ملک کا اقتدار اعلیٰ صنعتی، تجارتی فوجی، مذہبی اور اخباری وڈیروں سے ہمیشہ کے لئے چھین کر اس ملک کے محنت کش عوام کے حوالے کر دے گا۔ اس دن کے بعد اگر مارشل لاء ایک لمحہ کے لئے بھی جاری رہے تو پھر قائدِ عوام بھٹو سے ہماری کھلی جنگ۔

ہم بھٹو کو وقت دیتے ہیں کہ وہ خواہ مارشل لاء کے ذریعے ہی سے سہی سارے عوام دشمنوں کا صفایا کر دے۔

اُس وقت تک کے لئے میں بھی اپنے قلم کی تلوار نیام میں رکھتا ہوں۔

بقیہ: ـــ اداریہ

کی بحالی کے لیے صدر اور گورنروں کے حکم کو قانونی تحفظ دیا جائے لیکن ان کی شنوائی نہیں ہو رہی۔ ان مزدوروں نے بشیر کا راستہ اختیار کر لیا تو پھر کیا ہو گا ـــــ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔

تم اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے تو دیس کا اللہ مالک ہے۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
24, FEB. - 2 MARCH, 1972